انمول لوگ

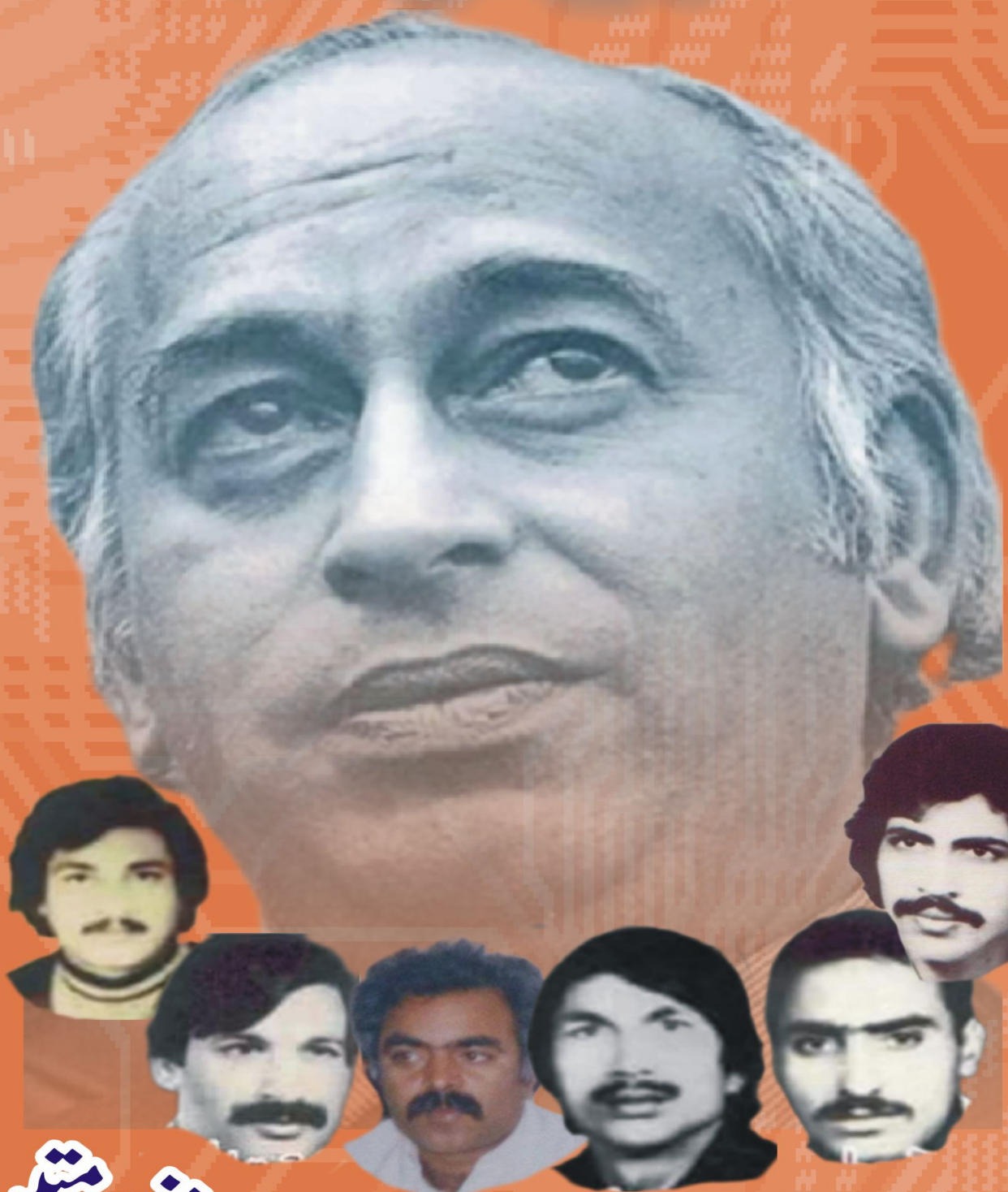

نذیر متین

انمول لوگ

نذیر متین

حسن ادب، فیصل آباد

AnmolLog
By
NazeerMateen

ARI ID: 1688708377628

جملہ حقوق بحقِ مؤلف محفوظ ہیں

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

کتاب: انمول لوگ

تحقیق وتدوین: نذیر متین (03014396346)

کمپوزنگ: منان لطیف

سرورق: اشرف اشعری

اشاعتِ اوّل: ۲۰۲۲ء

اہتمام: حسنِ ادب، فیصل آباد

قیمت: 450روپے

انتساب

قائدعوام شہید ذوالفقار علی بھٹو ، مادرِ جمہوریت نصرت بھٹو، دختر پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو، مردِ آہن مرتضیٰ بھٹو شہید، شاہنواز بھٹو، عبدالرزاق جھرنا ، لالہ اسد ، ادریس طوطی ، عبدالرشید عاجز ، ایاز سموں ، ادریس بیگ ، رحمت اللہ انجم ، ناصر بلوچ ، وحید قریشی ، راشد ناگی ، پرویز یعقوب کھوکھر ، عزیز ملک ، منور شہید، عثمان غنی ، جہانگیر بدر، قیوم نظامی ، اسلم گورداسپوری ، ڈاکٹر اسرار شاہ ، شاہدہ جبیں ، توقیر اکرم کاہرہ ، قاضی سلطان محمود منور سہروردی ، محمد بوٹا کھوکھر ، سردار سلیم ، قیوم بٹ ، شہلا رضا ز بیدہ ملک ، رفیع ملک ، رشید میر ، آغا اقبال ، بابو رشید مراجہ جمیل عباسی ، محمد شفیع مفیاض شاہ ، چاچا اللہ دادا ، بابو لطیف ، امتیاز خاں ، سرفراز شاہ ، راجہ طاہر ، کرنل حبیب ، شیخ لیاقت ، مراد شاز خٹک ، ، ملک الطاف حسین ، شوکت بیگ ، غلام حسین آفریدی ، ظفر الحق شاہ ، غلام علی شاہ ، غضنفر علی شاہ ایڈوکیٹ ، مشتاق بٹ ، نعیم بلہ ، ملک غلام مصطفی ، بلال سرور ، آغا ریاض السلام ، ریاض شہزاد ، قاضی اشفاق ، مرزا اختر بیگ ، انور بیگ ، محمد اشرف ، خالد شاد ، ریحانہ ملک ، باجی نصرت رشید ، شیخ عبدالقیوم ، ریاض ساجد ، نعیم اختر وارثی ، حامد سعید پیا ، راؤ اشفاق علی ، میجر آفتاب ، زبیر شاد ، آصف بٹ ، خواجہ معین الدین سید ، اقبال مسیح ، شیخ اقبال ، شہدائے سکرنڈ ، شہدائے کارساز ، شہدائے لیاقت باغ جیسے ان ہزاروں سرفروشوں کے نام جن کی قربانیوں کی داستانیں سن کر ظلم کے ایوان لرز اٹھے ۔

گلستان کو لہو کی جب ضرورت پڑی
سب سے پہلے ہی ہماری گردن کٹی

فہرست

❖	پیش لفظ	نذیر متین	۹
❖	کچھ کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں	رامش منہاس	۱۲
❖	سلام		۱۴
❖	پنڈی کے کوفے سے میں سندھ مدینے آئی ہوں		۱۵
❖	بنجر نہ کبھی کشتِ تمنا مری ہوگی		۱۷
❖	شملہ معاہدہ	مسعود راجپوت	۱۸
❖	المرتضیٰ ہاؤس کی یادگار تصویر		۲۰
❖	بھٹو کے صاحبزادے		۲۰
❖	بھٹو کا جیل سے خط		۲۱
❖	بھٹو کی پھانسی پر عوام کے نام	فیض احمد فیضؔ	۲۲
❖	بی بی سی کا تاریخی تبصرہ		۲۳
❖	تاریک دور		۲۴
❖	وسدی جھوک دے لوگ	جہانگیر مخلص	۲۵
❖	ڈھاکہ فال کی کہانی	مارک ٹیلی (بی بی سی)	۲۶
❖	جسٹس کے۔ایم صمدانی		۲۷
❖	اعترافِ جرم		۲۸
❖	بھٹو کے عظیم کارنامے		۲۹
❖	لازوال دوستی	سید فیصل رضا	۳۱
❖	ایٹمی پروگرام کا خالق		۳۵
❖	تم نے کبھی بہادر شخص کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا		۳۶
❖	انقلاب کو درآمد نہیں کیا جا سکتا		۳۶
❖	زندہ ہے بھٹو	رضا زیدی	۳۷
❖	بھٹو کا خطاب		۳۸
❖	عوامی سوٹ شلوار قمیض		۳۹
❖	اقتدار اور اسیری		۴۰
❖	جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا۔۔۔		۴۲

❖	فخر کا مقام		۴۲
❖	بھٹو کا خوف	چودھری منظور	۴۳
❖	انمول قائد		۴۴
❖	فکرِ بھٹو	شاہد حمید بھٹی (ایڈووکیٹ)	۴۵
❖	ایٹمی دھماکے	عمران قادری	۴۶
❖	معافی نامہ		۴۸
❖	غریب پاکستانیوں کے لیڈر قاعد عوام کا جنم دن		۴۹
❖	ایٹمی قوت بنانے والے عظیم رہنما		۵۰
❖	کیا آپ کو معلوم ہے؟		۵۰
❖	بھٹو کا ایٹمی پروگرام اور ہینری کسینجر کی دھمکی		۵۱
❖	دورہ فرانس		۵۲
❖	فقیروں کا بھٹو		۵۴
❖	زلفی بھٹو	محمد احمد ترازی	۵۵
❖	بابا بلھے شاہ		۶۰
❖	سپریم کورٹ میں بھٹو کا بیان		۶۱
❖	ضیاء الحقی مارشل لاء	کامریڈ رؤف لنڈ	۶۲
❖	پروانے جل اٹھے		۶۴
❖	یومِ سیاہ		۶۵
❖	یومِ عزم	زوار حسین کامریڈ	۶۶
❖	ڈرتے تھے بندوقوں والے۔۔۔	حبیب جالب	۶۹
❖	بھٹو مرتا کیوں نہیں		۷۰
❖	سوگ کا ماحول	شاہ زیب جیلانی	۷۱
❖	کٹ مرے اپنے قبیلے۔۔۔	احمد فراز	۷۳
❖	ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں۔۔	قمر الزماں کائرہ	۷۴
❖	مظلوم بہن کی فریاد	بے نظیر بھٹو	۷۵
❖	وہ دریا دیس سمندر تھی		۷۶
❖	یادگارِ کارساز		۷۶
❖	بھٹو کی شہادت کی پرسہ داری	زوار حسین کامریڈ	۷۷

❖ بہادر لوگ	اورنگزیب ظفر خان	۷۹
❖ پھانسی پانے والے جیالے		۸۲
❖ جالب میں اور کوٹ لکھپت جیل	ڈاکٹر اسرار شاہ	۸۳
❖ جالب میں اور جیل چھ (دوسری قسط)	ڈاکٹر اسرار شاہ	۸۶
❖ ایف۔آئی۔آر	احمد نواز امروہوی	۸۹
❖ بھٹو شہید پارک		۹۱
❖ بھٹو کیوں زندہ ہے		۹۲
❖ گمنام ہیرو		۹۳
❖ شہدائے خیر پور ناتھن شاہ		۹۴
❖ تاریخ کا سب سے بڑا جلسہ		۹۵
❖ شہدائے سکرنڈ		۹۶
❖ اے پتر ہٹاں تے نہیں وکدے		۹۷
❖ شاہدہ جبین		۹۹
❖ پچاس سالہ تاریخ		۱۰۱
❖ بھٹو کیسے زندہ ہے اور کیوں زندہ رہے گا		۱۰۳
❖ ڈاکٹر مبشر حسن اور عشق بھٹو	زوار حسین کا مریڈ	۱۰۷
❖ سیاسی اسیران		۱۰۹
❖ بھٹو کہانی		۱۱۰
❖ یہ بھی وقت تھا		۱۱۱
❖ ۵۴ جیالے	اورنگزیب ظفر	۱۱۲
❖ اورنگزیب ظفر خان		۱۱۶
❖ اور جہاز پھٹ گیا		۱۱۷
❖ محمد بوٹا کھوکھر		۱۱۸
❖ جیل سے خط		۱۱۹
❖ میاں محمد جہانگیر ایڈووکیٹ (مرحوم)		۱۲۰
❖ آہ! پی پی پی		۱۲۱
❖ راجہ طاہر		۱۲۲
❖ ۶ چکی ساہیوال		۱۲۳

❖ کراچی کا شیر		۱۲۴
❖ توقیر اکرم کائرہ		۱۲۵
❖ مجھے فخر ہے		۱۲۶
❖ محترمہ بے نظیر بھٹو		۱۲۷
❖ نصیر اللہ خان بابر		۱۲۸
❖ ہمیں بھی یاد کر لینا		۱۲۹
❖ آجاؤ	فیض احمد فیضؔ	۱۳۰
❖ بھول بھی کیسے سکتے ہیں		۱۳۱
❖ دہشت گردی کا لیبل		۱۳۲
❖ طاقت کا سرچشمہ		۱۳۳
❖ منشور	اسلم گورداس پوری	۱۳۴
❖ الوداع بابا	نور الہدیٰ شاہ	۱۳۶
❖ نایاب ویڈیو		۱۴۰
❖ انقلابی شاعر		۱۴۲
❖ توقیدی ہے پرچھائیں کا		۱۴۳
❖ رحمت اللہ انجم		۱۴۴
❖ شہید علی محمد ہنگورو	مسعود احمد بھلائی	۱۴۵
❖ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۶		۱۴۷
❖ کالی رات	فاطمہ بھٹو	۱۴۹
❖ شہادتوں کے علم		۱۵۱
❖ احمد سعید اعوان		۱۵۲
❖ عارف خان		۱۵۴
❖ عوامی ہیرو عبدالرشید عاجز شہید		۱۵۵
❖ بی بی بے نظیر کی شہادت پر	اسلم گورداس پوری	۱۵۷
❖ وقت کی پکار، بے نظیر بار بار	ابرار میر (لندن)	۱۵۹
❖ میجر آفتاب احمد		۱۶۲
❖ آغا محمد نعیم		۱۶۴
❖ بلاول بھٹو کا پیغام		۱۶۵

❖ عبالرزاق جھرنا		۱۶۶
❖ ہاں ہاں زرداری مجرم ہے	پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف اعوان	۱۶۷
❖ چشم کشا انٹرویو	اسلم گورداس پوری	۱۷۰
❖ شاہی قلعہ		۱۷۳
❖ لال سلام	محمود اختر	۱۷۴
❖ سید قمر عباس		۱۷۵
❖ اساں مرنا ناہیں		۱۷۸
❖ بھٹو آج تک لوگوں کے دلوں میں کیوں زندہ ہے		۱۷۹
❖ بزدل قوم کا بہادر لیڈر		۱۸۰
❖ محمد سعید بھٹہ ایڈووکیٹ		۱۸۱
❖ چھوٹے قد کا بڑا آدمی		۱۸۲
❖ ذوالفقار علی بھٹو کی سپریم کورٹ میں آخری تقریر		۱۸۵
❖ چیئرمین بھٹو شہید کے بہادر اور غیرت مند بیٹے		۱۸۷
❖ ٹر گئے یار محبتاں والے		۱۸۹
❖ یہ بازی عشق کی بازی ہے۔۔۔۔		۱۹۲
❖ اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر		۱۹۵
❖ میر مرتضیٰ بھٹو		۱۹۷
❖ عبدارزاق جھرنا		۱۹۸
❖ ایاز سموں		۱۹۹
❖ ہائی جیکنگ کیس، ناصر بلوچ		۲۰۰
❖ ادریس بیگ		۲۰۱
❖ ادریس طوطی		۲۰۲
❖ عثمان غنی		۲۰۳
❖ محبت کی انتہا		۲۰۴
❖ کیا یہ وزیراعظم نہیں تھا		۲۰۵

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

پیش لفظ

کہتے ہیں جب سقراط کو زہر کا پیالہ دیا گیا اور اس نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے ہونٹوں سے لگانا چاہا تو اس کے ایک شاگرد نے زار قطار روتے ہوئے کہا ''استاد مجھے افسوس ہے کہ آپ بے گناہ مارے جائیں گے'' سقراط نے زہر کے پیالے کو ذرا اور مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا میں بے گناہ ضرور مارا جاؤں گا لیکن میری یہ بے گناہی مجھے تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔تم اپنا مشن جاری رکھنا'' حقیقت بھی یہی ہے کہ ابدی زندگی انہی کو نصیب ہوتی ہے جو بے گناہ مارے گئے یا جو کسی عظیم مقصد کی خاطر اپنے نظریے کی صداقت کا پرچم بلند رکھتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے،

یہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ آزاد منش لوگوں نے اپنی آزادی کے لیے ہمیشہ رسم دار کو زندہ رکھا ۔ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی منصور ضرور پیدا ہوا جس نے اپنے عہدِ وفا کو نبھانے کے لیے اس رسم کو زندہ رکھنے کے لیے یہ علان کیا کہ:

ہم ہیں منصور اس زمانے کے
ہم سے ہی رسمِ دار زندہ ہے

انسانی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہنسی خوشی زندگی قربان کرنے کا جذبہ اور سرفروشی کی رسم کے پس منظر میں دو محرکات بہت نمایاں رہے ایک تو مذہب اور دوسرا سیاسی فلسفہ۔انسانی وقار اور تقدیس کو زندہ رکھنے والی سوچ اور فکر کی آزادی ضمیر کی آواز کی سربلندی کے لیے جن لوگوں نے کسی سیاسی پلیٹ فارم پر جدوجہد کی انسانی قدروں کی پاسداری اور حقیقی جمہوری معاشرے کے لیے جدوجہد کی بلاشبہ تاریخ انسانی میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سرفروشی کے اس قبیلے میں مذہب بالخصوص اور معاشی وسیاسی جدوجہد بالعموم کرنے والے نمایاں عناصر کے طور پر موجود رہے اور اس مشن کی تکمیل کے لیے نجانے اور کتنے بے گناہ حقِ زندگی سے محروم کر دیے گئے مگر ان لوگوں نے وطن کی مٹی سے عہدِ وفا نبھانے کے لیے وہ تمام قرض ادا کیے جو ان پر واجب نہ تھے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

دنیا بھر میں اٹھنے اور ابھرنے والی سیاسی تحریکیں کسی نہ کسی مقصد اور کسی نہ کسی نظریے کی ترقی کے لیے معرض وجود میں آئیں بعض کو کامیابی نصیب ہوئی اور بعض اپنا مقصد و مدعا حاصل نہ کر پائیں لیکن ان میں حصہ لینے والوں اور اہم کردار ادا کرنے والے رہنماؤں اور کارکنوں کو ضرور خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

برصغیر کی سیاسی تحریکوں میں شامل بے شمار نام ایسے ہیں جن کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا مگر طول کلام سے دامن بچاتے ہوئے میں صرف پاکستان میں ان سیاسی کارکنوں تک محدود رہوں گا جو ضیاء کے مارشل لاء کے دور میں جسے میں بدترین مارشلائی دور کہتا ہوں بھٹو شہید کے جیالوں کے طور پر مارے گئے جو تاریک راہوں میں بے گناہ شہید کر دیے گئے جن سے زندگی کا حق چھینا گیا قید و بند کی صعوبتیں عطا کی گئیں کوڑے مارے گئے جلاوطن کیے گئے کوئی ایسا ظلم نہ تھا جو ان پر روا نہ رکھا گیا مگر انھوں نے اپنے نظریے سے غداری نہ کی۔

اس کتاب کا مقصد نہ تو بیان وزبان کی چاشنی کی داد لینا ہے نہ کسی کی بلاوجہ اور بے جا تعریف وتائید کرنا ہے نہ مجھے مالی معاونت درکار ہے اور نہ میں کسی بھی لالچ میں مبتلا ہوں۔ مجھے تو صرف اور صرف ان بہادر نڈر جیالوں سے محبت ہے اور میں ان کو خراج تحسین وعقیدت پیش کرنے کا خواہش مند ہوں جنھوں نے ایک سچے اور کھرے اور انصاف پر مبنی معاشرے کی تشکیل اور اس کی بقا کے لیے جدوجہد کی ایسے معاشرے کا خواب دیکھا جہاں انسان کو شرف انسانی سے محروم نہ کیا جا سکے۔ جہاں انسان کو فطری آزادی اور اظہارِ رائے کا پورا پورا حق ہو۔ اس فرسودہ نظام کی تبدیلی کے لیے جس طلسماتی شخصیت نے پاکستانی نوجوانوں کو وہ قوت اور جذبہ عطا کیا اس کا نام ذوالفقار علی بھٹو ہے۔ پاکستان عوام کی خاطر ایک زندہ نظریہ اپنی جگہ نہایت اہم تھا۔ بھٹو صاحب کی ذات اور ان کا اندازِ سیاست کارکنوں سے ان کی محبت اور سحر انگیز طلسماتی شخصیت نے ان نوجوانوں کے دلوں میں اس قدر گھر کر لیا کہ وہ ان پر جان دینے کو بھی تیار ہو گئے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان جدوجہد کرنے والوں میں بھاری اکثریت ان نوجوانوں کی تھی جن کی عمریں بیس سال سے تیس سال کے درمیان تھیں۔ ان لوگوں نے اپنے قائد کو بچانے کے لیے خودسوزی کی کوڑے کھائے قید و بند کی

تکلیفیں برداشت کیں اور یہاں تک کہ پھانسی کے پھندوں پر بھی جھول گئے ۔شاید ہی کسی سیاسی رہنما کو یہ مقام حاصل ہوا ہو کہ اس کے چاہنے والوں اور کارکنوں نے اس کی ذات کے لیے اس قدر محبت کی ہو جب ان کو تختہ دار پر لٹکایا جاتا تھا تو وہ جیے بھٹو کا نعرے لگاتے تھے۔ان پر کوڑوں کی بارش کی گئی تو انہوں نے جیے بھٹو کا نعرہ لگایا۔

کارکنوں کی اس فہرست میں خودسوزی کرنے والے سانحہ کارساز سانحہ لیاقت باغ اور سانحہ ایم آر ڈی کے ہزاروں شہیدوں کے نام شامل ہیں ۔بعض دانشوروں کے نزدیک بھگت سنگھ اس دھرتی کا ہیرو ہے لیکن کیا عبدالرزاق جھرنا کی قربانی ان کو نظر نہیں آتی جو رقص کرتے ہوئے جھومر ڈالتے ہوئے تختہ دار کی طرف گیا اور جیے بھٹو کا نعرہ لگاتا ہوا پھانسی کے پھندے سے لٹک گیا۔

میں نے مختلف جگہوں یوٹیوب ،گوگل ،فیس بک ،سوشل میڈیا ،اخبارات ،رسائل ،مختلف کتب اور بہت سے لوگوں کے انٹرویو اور ذاتی ملاقاتوں سے تحریریں حاصل کر کے ان کو کتابی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس کے لیے میں ان تمام احباب خصوصا اورنگزیب ظفر خ خان کا شکر گزار ہوں جو میرے لیے معاون ثابت ہوئے ۔آخر میں اک گزراش پیپلز پارٹی کی قیادت سے کرنا چاہوں گا کہ بلاشبہ اس پارٹی کی بنیادوں میں بے شمار لوگوں کا خوں شامل ہے کہ وہ لوگ جن کا ذکر اس کتاب میں شامل ہے جو ابھی تک گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں ان تک یا ان کے خاندونوں تک رسائی حاصل کی جائے ان کا پتہ لگایا جائے اور ان کے لواحقین کے لیے پارٹی کی سطح پر ایک ٹرسٹ قائم کیا جائے ۔آخر میں بلاول بھٹو سے اپیل کروں گا کہ آپ شہادتوں کے امین اس پارٹی کے چیئر مین ہیں بھٹو شہید اور بی بی شہید کے سیاسی ورثے کے مالک ہیں ۔آپ اس ملک کے لاکھوں محنت کشوں ،مزدوروں ،کسانوں اور طالب علموں کے روشن مستقبل کی امید ہیں اس لیے اپنے کارکنوں کا ضرور خیال کیجیے جن کی زبانوں پر کل بھی جیے بھٹو کا نعرہ تھا اور آج بھی وہ جیے بھٹو کا نعرہ لگاتے ہیں۔

راہ تاریک تھی ہم دیپ جلاتے ہی رہے
اپنی پلکوں سے چنے خار مغیلاں ہم نے
پا بہ زنجیر سوئے دار و رسن جاتے رہے
تہی ہونے نہ دیا رسن زنداں ہم نے

نذیر متین

کچھ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں

نذیر متین سے میرا تعلق نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ بچپن کے معصوم ایام سے لے کر بڑھاپے کی دہلیز تک بہت سا سفر اکٹھے گزارنے کی وجہ سے ایک دوسرے کی مزاج شناسی بھی درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے زمانہ طالب علمی سے آج تک زندگی کی بہت سی راہوں پر اکٹھے سفر کیا اس لیے دیگر دوستوں کی رائے ہے کہ نذیر متین کو جتنا میں جانتا ہوں دوسرا اور کوئی نہیں کسی حد تک یہ بات درست بھی ہے میں ان کے مزاج، خیالات اور سیاسی وسماجی نظریات کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ خود بھی حامی ومعترف ہوں۔

ان کے اندر قدرت نے کچھ ایسی خوبیاں رکھی ہیں جو آج بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ کلمہ حق کہنا رزق حلال پر یقین رکھنا اپنے اور اپنے خدا پر مکمل یقین رکھنا پسے ہوئے اور مجبور لوگوں کی آواز سننا اور ان کی آواز بننا اور خاص طور پر اپنے نظریات پر قائم رہنا ان کی شخصیت کے وہ پہلو ہیں جنھوں نے اس کی ذات کو باوقار بنایا ہوا ہے۔

زندگی کو بڑے قریب سے دیکھنے والا نذیر متین خوب جانتا ہے کہ خوشی کسے کہتے ہیں اور غم کیا ہوتا ہے گھر کیسے آباد ہوتے ہیں، بستیاں کیوں اجڑتی ہیں؟ بھوک کیا ہے؟ زندگی کی راحتیں کیسے ملتی ہیں اور مفلسی چہروں کو کیسے بگاڑتی ہے کسی کے جنازے میں کم سے کم یا زیادہ لوگوں کی شرکت کیا معنی رکھتی ہے۔ مزدوروں، محنت کشوں، طالب علموں اور سیاسی کارکنوں کی جدوجہد کن کن مراحل سے گزرتی ہے اور ضروریات زندگی کی افراط اور کمی کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ ان کی چالیس سالہ صحافتی زندگی نے ان کے اندر سوچ وفکر کی جو پختگی پیدا کر دی ہے وہ انہیں ہر موڑ پر سچ بولنے پر مجبور کرتی ہے۔ معاشرتی ناہمواری اور سماج میں موجود ہر برائی کا وہ شدید مخالف ہے اور برملا اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ نذیر متین کی یہ تعریف بھی دراصل ایک اظہار حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس سے کوئی بھی غیر جانب دار قاری انکار نہیں کر سکتا۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بہت سے ایسے

نام بھی موجود ہیں جنھوں نے فرسودہ سیاسی وسماجی نظام بدلنے کے لیے مخلصانہ کوششیں کی ہیں ایسے لوگوں کے نام تاریخ کے سینے پر ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ وقتاً فوقتاً اٹھنے والی سیاسی تحریکوں کے رہنماؤں کی کاوشیں اور جدوجہد اور اس کے نتیجے میں سیاسی سماجی تبدیلیاں بھی تاریخی اوراق کا حصہ ہیں لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیاسی جدوجہد کرنے والے رہنماؤں میں اپنے کارکنوں اور عوام کی طرف سے جو پیار محبت اور والہانہ عقیدت ذوالفقار علی بھٹو کو ملی کسی اور کو نصیب نہ ہوسکی، یہ اسی عقیدت کا نتیجہ ہے کہ طویل عرصے کے بعد بھی پیپلز پارٹی بھٹو صاحب کی طلسماتی شخصیت ان کی جدوجہد اور ان کی شہادت کا اعزاز رکھتے ہوئے قائم ودائم ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشلائی دور میں پارٹی کے قائدین اور کارکن جن جن مشکلات سے گزرے اور ثابت قدم رہے وہ پارٹی کا اثاثہ ہے۔ نذیر متین نے ان تمام کارکنوں پر ہونے والے ظلم وستم کو باچشم خود دیکھا اور ان کا درد محسوس کیا وہ اس بات پر نالاں ہس کہ آج تک پارٹی کے کارکنوں کو وہ مقام نہیں دیا گیا جو شہید بھٹو کا وژن تھا اسی لیے بنیادی کارکن گمنامی میں چلے گئے یا خاموش ہوکر گھر بیٹھ گئے سندھ میں تو صورت حال کچھ بہتر رہی جبکہ باقی صوبوں خاص طور پر وہ پنجاب میں روایت کو برقرار نہ رکھ سکی اس لیے صاحب کتاب نے اپنی اس کتاب میں ان جیالوں کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ارباب اختیار سے یہ بھی اپیل کی ہے کہ اگر پارٹی سماجی تبدیلی کے لیے کچھ کام کرنا چاہتی ہے تو اسے ہر مقام پر ان بنیادی کارکنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی دلجوئی کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی مالی پریشانیوں کے پیش نظر ایک ٹرسٹ بنا دیا جائے تو یہ ایک مثبت پیش رفت ہوگی یہ کتاب دراصل انہی کارکنوں کو خراج تحسین اور ہدیہ عقیدت پیش کرنے کی کوشش ہے جو سیاسی جدوجہد کی روشن علامت ہیں اور جن سے کسی بھی پارٹی کا وقار اور بھرم قائم رہتا ہے۔ میں جناب نذیر متین کو اس کاوش پر حرف ستائش پیش کرتا ہوں ان کا بے لوث جذبہ اور کارکنوں سے ان کی محبت خود ان کے لیے بھی باعث افتخار ہوگی اور ان کا نام روشن رہے گا۔

سپرد خاک تو ہونا ہے ایک دن رامش
کئی دلوں میں ہمارے مزار بھی ہوں گے

رامش منہاس

سلام

قائدعوام شہید ذوالفقار علی بھٹو کا قتل حقیقت میں روشنی کا قتل ہے۔ وہ روشنی جسے پاکستان دکھانے کے لیے پاکستان کے محنت کش۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے جھنڈے تلے ایک ہوئے اور پھر 4 اپریل 1979ء کو غریبوں کی اس روشنی کو قتل کر دیا گیا۔

پنڈی

کے

کوفے سے

پنڈی کے کوفے سے
میں سندھ مدینے آئی ہوں
مت پوچھو کیا کھو آئی ہوں
مت پوچھو میں کیا لائی ہوں
کچھ منظر ہیں کچھ

یادیں ہیں
کچھ آنسو ہیں
کچھ فریادیں ہیں
کچھ لمحوں کی
سوغاتیں ہیں
کچھ گھڑیوں کی
رودادیں ہیں
کچھ سنگ زادوں
کے تحفے ہیں
جو کچھ بھی ملا لے
آئی ہوں
زینب کے خطبات کا صدقہ
شبیر سے مانگ کے لائی ہوں

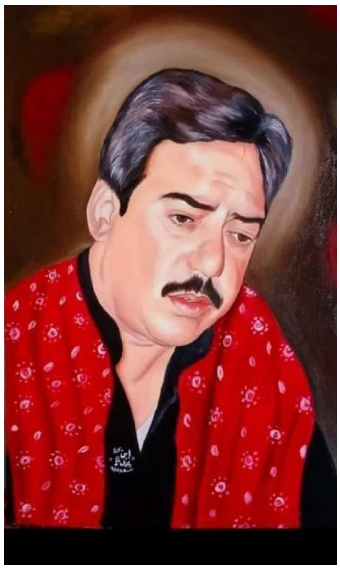

بنجر نہ کبھی کشت

بنجر نہ
کشت
میری
اک فرد
نہیں
سر ہیں تو سرِ دار قلم اور بھی ہوں گے
ہم
رہیں
ہم اور
ہوں

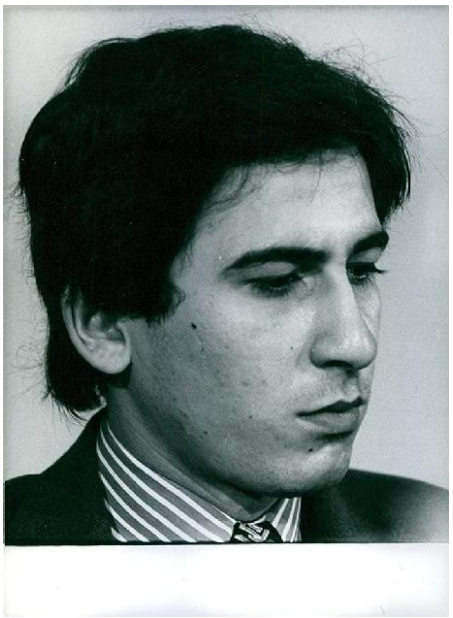

تمنا میری ہوگی

کبھی
تمنا
ہو گی
کا مرنا
انسان کا مرنا
مرتے
گے مگر
بھی
گے

کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ قتل عام ہوتی رہی

شملہ معاہدہ

مسعود راجپوت

یہ 1972ء کی بات ہے۔لاہور کے ائیر پورٹ پر ملک کے حکومتی اور اپوزیشن کے سرکردہ راہنما خان عبدالولی ،مولانا مفتی محمود شاہ احمد نورانی ، پروفیسر غفور احمد ،سردار شوکت حیات ، گورنر وزرائے اعلیٰ ، وفاقی اور صوبائی وزیر بیوروکریٹ بڑی تعداد میں موجود ہیں ۔ جو ملک صدر ذوالفقار ولی بھٹو کو ہندوستان روانگی کے وقت ملی یکجہتی اتفاق اور اعتماد کے ساتھ رخصت کر رہے ہیں تا کہ بھارت کو معلوم ہو کہ ایک بڑا سانحہ جو بنگلہ دیش کی صورت میں واقع پذیر ہوا تھا اس کے علاوہ 5000 مربع میل علاقہ 93000 جنگی قیدی جو بھارت کی قید میں تھے کے باوجود یہ قوم اب ایک

چٹان کی طرح متحد قوم ہے اور اب یہاں فوجی نہیں عوامی حکومت قائم ہے۔قائد عوام تمام لیڈروں سے گلے ملے اور سب کے اعتماد اور دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوئے۔اگلے دن شملہ میں مذکرات کی میز سج گئی۔پاکستانی وفد کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو کر رہے ہیں جو نیلے لکیر دار سوٹ میں ملبوس ہیں جبکہ بھارتی وفد کی سربراہی اندرا گاندھی کر رہی ہیں۔جو بنارس کی ساڑھی میں ملبوس ہے۔بھارتی وفف کا غرور اور تکبر دیکھنے والا ہے کیونکہ وہ جنگ 71ء کا فاتح ہے جبکہ ذوالفقار علی بھٹو خالی ہاتھ ہے۔مذکرات کئی گھنٹے جاری رہے بات کبھی بنتی تو کبھی بگڑ جاتی ہے بھارت کشمیر سے دستبردار ہونے اور بنگلہ دیش تسلیم کرنے پر اڑا ہوا ہے۔جبکہ پاکستان دونوں باتوں کے لیے تیار نہیں۔پاکستان اپنے علاقے اور قیدیوں کی باعزت واپسی چاہتا ہے۔وفود کے چہروں پر مایوسی ہے۔دنیا بھر کے اخبار نویس انتظار میں ہیں کہ کیا ہوتا ہے اچانک ذوالفقار علی بھٹو اندرا گاندھی کو لان میں ایک طرف لے جا کر گفتگو کر رہے ہیں تمام لوگ یہ منظر بہت ہی دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں بلکہ

پاکستانی وفد کے ارکان جو کہ زیادہ تر نوجوان ہیں جن میں عبدالحفیظ پیرزادہ، حیات محمد خان شیر پاؤ، مولانا کوثر نیازی، ممتاز علی بھٹو، غلام مصطفی کھر، غلام مصطفی جتوئی جبکہ چند سینئر جن میں سیکرٹری خارجہ

عزیز احمد، ارباب سکندر خان خلیل وغیرہ شامل تھے کے چہروں پر کرب کے آثار بہت ہی واضح تھے۔ذوالفقار علی بھٹو اور اندرا گاندھی کی گفتگو بائیس منٹ تک جاری رہی۔زیادہ تر باتیں بھٹو صاحب کرتے رہے۔بیچ میں اندرا گاندھی بھی بولتی رہی۔اندرا گاندھی نے سر اٹھا کر ذوالفقار علی بھٹو کی طرف دیکھا اور مثبت انداز میں سر ہلایا اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کے چہرے پر فاتحانہ

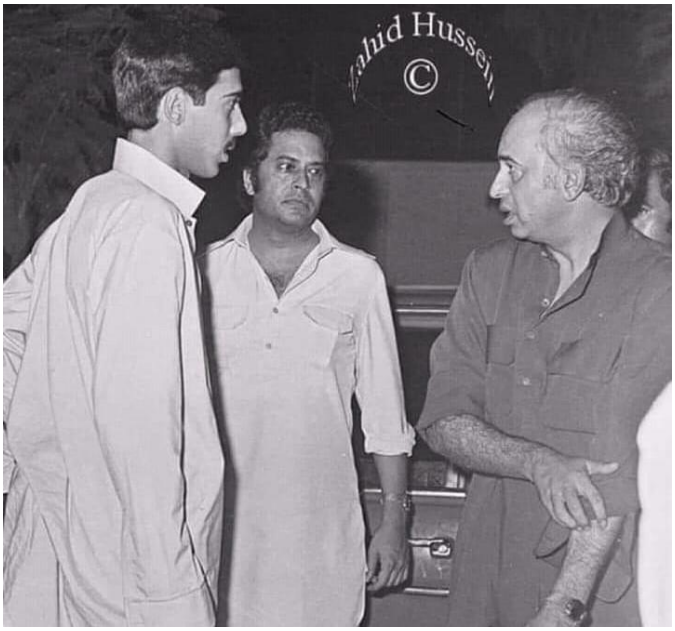

مسکراہٹ آ گئی۔اپنے وفد کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا جو اپنے قائد کی ہر ادا کو برسوں سے جانتے تھے جو سمجھ گئے تھے کہ قائد کا جادو چل گیا ہے دونوں مذکرات کی میز کی طرف لوٹے اور ڈرافٹ کی تیاری شروع ہوگئی۔93000 قیدی رہا ہوں گے اور 5000 مربع میل کا علاقہ واپس ہو گا

۔کشمیر متنازعہ علاقہ ہوگا۔میدان جنگ میں ہاری ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر دلیل کے بادشاہ ذوالفقار علی بھٹو نے جیت لی تھی۔ پاکستان میں جشن کا سماں تھا۔جنگی قیدیوں کے گھروں ممیں عید کا چاند اتر آیا تھا۔علاقوں کے لوگ اپنے پیاروں سے ملنے کے لیے بے تاب تھے اور اگلے روز راولپنڈی ائیر پورٹ پر لاکھوں لوگ اپنے محبوب قائد کو والہانہ انداز میں خوش آمدید کہنے کے لیے

دیوانہ وار جا رہے تھے۔ جیے بھٹو۔

المرتضی ہاؤس لاڑکانہ میں آخری تصویر

ذوالفقار علی بھٹو کی اپنے گھر المرتضی ہاؤس لاڑکانہ میں آخری تصویر جو 17 ستمبر 1977 کی رات گرفتاری سے چند لمحے قبل وہ اپنے بیٹے مرتضی بھٹو اور دوست طفیل شیخ کو ہدایات دے رہے ہیں جبکہ باہر آرمی گھر کا محاصرہ کر چکی تھی اس کے بعد بھٹو صاحب زندہ اپنے گھر کبھی نہیں لوٹے۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو کے یہ خوبصورت بچے بہت ہی بے دردی کے ساتھ شہید کیے گئے وجہ

صرف یہ تھی کہ ان کے باپ نے غریب کو ان کا حق دیا، ایٹمی پروگرام شروع کیا اور اس طرح سینکڑوں کام اور بھی تھے جو سرمایہ داروں اور اسٹیبلشمنٹ کو منظور نہیں تھے۔

بینظیر بھٹو کی سالگرہ پر جیل سے خط

ذوالفقار علی بھٹو کا اپنی بیٹی بینظیر بھٹو کی سالگرہ پر جیل سے خط۔۔۔بھٹو نے خط میں جن الفاظ کا استعمال کیا سن کر آپ کے آنسو چھلک پڑیں گے۔ جیالے ضرور یہ تاریخی الفاظ سنتے، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ زندہ ہے بھٹو زندہ ہے۔

’’میری سب سے پیاری بیٹی !اس جیل کی سلاخوں میں تمہیں کیا تحفہ دے سکتا ہوں ۔جن سلاخوں سے میں اپنا ہاتھ باہر نہیں نکال سکتا۔ جو خود بھی نظر بند ہو اور اس کی ماں بھی نظر بند ہو۔محبت اور ہمدردی کا پیغام ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں کیسے جائے ؟ایک ہتھکڑی سے دوسری

ہتھکڑی تک یہ مبارک باد کیسے پہنچے ؟تمہارے دادنے مجھے فخر کی سیاست سکھائی اور تمہاری دادی نے مجھے غربت کی سیاست کا سبق دیا۔میں ان دونوں باتوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں ۔صرف عوام پر یقین رکھو اور ان کی فلاح کے لیے کام کرو اللہ تعالی کی جنت تمہاری والدہ کے قدموں تلے ہے اور سیاست کی جنت عوام کے قدموں تلے ہے۔

فیض احمد فیض کا شہید ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر عوام کے نام

کبھی تو سوچنا یہ تم نے کیا کیا لوگو
یہ کس کو تم نے سرِ دار کھو دیا لوگو
ہوائے بغض و خباثت چلی تو اپنے ساتھ
اڑا کے لے گئی انصاف کی قبا اپنے ساتھ
دیا تھا صبح ِ مسرت نے اک چراغ ہمیں
اسی کو تم نے سرِ شا کھو دیا لوگو
سلا دیا جسے زنداں میں تم نے موت کی نیند
جگائے گی اسے حالات کی صدا لوگو

بی بی سی کا تاریخی تبصرہ

بھٹو کی پھانسی پر بی بی سی کا تبصرہ آج تک یاد کیا جاتا ہے۔
احسان فراموش پاکستانیوں نے اپنا ہی لیڈر مار ڈالا.....

چالیس سال گزرنے کے بعد بھی یہ لفظ ہماری قومی تاریخ پر ایک زوردار طمانچہ ہیں۔شاید تیس سے بھی کم لوگوں نے بھٹو کا جنازہ پڑھا۔ضیاء کا جنازہ دس لاکھ افغانیوں نے پڑھا۔جنازے اوران کی تعداد مرنے والوں کی عظمت نہیں بیان کیا کرتے۔رسول کریمؐ، فاطمہؑ،حسینؑ،حسنؑ کے جنازوں میں کتنے لوگ شریک تھے؟ تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔کس کی سوچ نے زمانے کو نئی زندگی دی اورکون حق پر تھا؟

5 جولائی 1977ء کا شب خون صرف جمہوریت پر ہی نہیں بلکہ انسانیت، مذہبی آزادی اورحقِ رائے پر شب خون تھا۔شاہی قلعے کی سرنگوں میں آج بھی اس رقص کی یادیں موجود ہیں جو رزاق جھرنا نے موت کا پھندا گلے میں ڈالنے سے پہلے بیرک سے پھانسی گھاٹ تک ایک پاؤں پر ناچتے ہوئے کیا تھا۔

ضیاء الحق کے سیاہ دور میں تشدد یا تختہ دار کے ذریعے شہید کیی جانے والے چند شہدائے جمہوریت۔

تاریک دور

جب پاکستان میں ایک تاریک دور کا آغاز ہوا۔ پھانسی کوڑے طویل المعیاد سزائیں سیاسی

کارکنوں کا مقدر بنیں ۔ پاکستان کے سیاسی ،سماجی کلچر کو یکسر تبدیل کر دیا گیا ۔کلاشنکوف کلچر اور سعودی برانڈ اسلام کو درآمد کیا گیا ۔روس افغانستان جنگ میں دلالی جہادی کلچر کے فروغ نے پاکستان کو بارود کے ڈھیر میں بدل دیا۔جس کی آگ میں ہم آج تک سلگ رہے ہیں۔

وسدی جھوک دے لوگ

اساں وسدی جھوک دے لوگ ھاسے ساڈیاں جھمراں میلے جاگے ہن

ساڈے سارے بھاگ سھاگے ہن ایں ہسدے وسدے ویلے وچ
ہک دھرتی جایا آیا ھا ساکوں نندروں آنڑ جگایا ھا
او روشن سجھ امیدیں دا او نور ھا ساڈیاں دیدیں دا
پر وقت دے اندھے آمر کوں اونھ ویلھے دے ہک جابر کوں
ساڈا رل کے جیونڑ نی بھانڑاں ساڈا سانجھا تھیونڑ نی بھانڑاں
او غاصب روح دیاں فصلاں دا او قاتل ساڈیاں نسلاں دا

اوندا لعل بلاول ول آوے
جیے بھٹو جیے، جہانگیر مخلص

ڈھاکہ فال کی کہانی

ڈھاکہ فال کی کہانیbbc کے مارک ٹیلی کی زبانی (تصویر کے دونوں رخ)

مارک ٹیلی کو اسی کی دہائی میں رہنے والے لوگ تو اچھی طرح جانتے ہین خصوصاً جیالے کیونکہ چیئر مین بھٹوشہید کے کیس کی بھی ساری کوریج مارک ٹیلی نے کی۔ میں نے پہلی بار مارک ٹیلی کو 5اپریل 1979 کوقریب سے لیاقت باغ میں چیئر مین بھٹوشہید کے غائبانہ نمازِ جنازہ میں دیکھا جہاں وہ بڑا سا کیمرہ کندھے پر اٹھائے نظر آئے اورانھوں نے ہم سے یہ بھی پوچھا کہ جنازے میں شرکت کے لیے کون کون لیڈر آرہا ہے۔ مجھے تو خیر اپنا ہوش نہیں تھا۔غائبانہ نمازِ جنازہ کا احوال پھر کسی اور موقع پر لکھوں گا۔۔دماغ جیسے شل تھا۔ 4اپریل کی رات بی بی سی پر ان کے بیان پر راولہنڈی کے وکیل وہاب الخیری نے ان کے خلاف مقدمہ بھی درج کروایا۔وہ خود انڈیا میں پیدا ہوئے اس لیے اردو ہندی بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔اس وڈیو میں انھوں نے ڈھاکہ فال کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ ظلم صرف پاکستانی آرمی نے ہی نہیں مکتی باہنی مسلح جنگجوؤں نے بھی کئے مگر ظاہر ہے آرمی کا پلہ بھاری تھا۔اس لیے مکتی باہنی کے جنگجوؤں کو زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔

جسٹس کے ایم صمدانی

جب ستمبر 1977ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کیا گیا تو پیپلز پارٹی کے وکلاء نے لاہور ہائی کورٹ میں ضمانت کی درخواست جمع کروائی مگر اس درخواست کو سننے کیلیے کوئی بھی جج تیار نہیں تھا۔کوئی جنرل ضیاءالحق کی ناراضگی مول لینے کو تیار نہیں تھا۔تب اس مردِمجاہد جسٹس کے ایم صمدانی نے اس کیس کی سماعت کی اور بھٹو کی احمد رضا قصوری کے قتل کے الزام میں گرفتاری پر ضمانت منظور کر لی اور یہ بات

جنرل ضیاء الحق کو بہت بری لگی کیونکہ ضیاء الحق کے دباؤ کے باوجود انہوں نے ضمانت دے دی اور بھٹو کو آزاد کر دیا مگر تین دن کے بعد فوج نے بھٹو کو لاڑکانہ سے گرفتار کر لیا۔ جسٹس کے ایم صمدانی لاہور ہائی کورٹ کے سینئر ترین جج تھے اور وہ چیف جسٹ بننے والے تھے مگر ضیاء الحق نے ان کو عدالت سے نکال کر وفاقی لاء سیکرٹری بنا دیا اور مولوی مشتاق کو لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا۔

اسی دن جنرل ضیاء الحق نے وفاقی سیکٹریوں کا اجلاس بلوایا جس میں جسٹس صمدانی بھی لاء سیکرٹری کے طور اس اجلاس میں موجود تھے۔ جنرل ضیاء الحق ڈکٹیٹر نے تمام سیکرٹریوں کو دباؤ میں لانے کے لیے کہا کہ آپ لوگ سدھر جائیں ورنہ میں آپ کی پینٹ اتار دوں گا سول بیوروکریٹ نے یہ سنتے ہی ایک دوسرے کے چہرے دیکھنے شروع کر دیے اس دھمکی آمیز رویے پر جب چپ سادھ لی تب اس مردِ مجاہد جسٹس نے ضیاء الحق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اپنے کتنے جنرلز کی پینٹیں اتاریں ہم خود بخود اپنی پتلونیں اتار دیں گے جسٹس صمدانی کے ایسے الفاظوں نے ضیاء الحق کو برہم کر دیا اور وہ اجلاس ملتوی کر کے غصے سے اٹھ کر چلے گئے جب سب وفاقی سیکرٹری جانے لگے تو ضیاء الحق کے اسٹاف آفیسر میجر جنرل خالد محمود عارف (کے ایم عارف) نے جسٹس صاحب سے کہا کہ ضیاء الحق صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ صمدانی صاحب ضیاء الحق کے کمرے میں گئے تو ضیاء الحق نے کہا کہ آپ نے اجلاس میں غلط کیا اس پر معذرت کریں تو جسٹس صمدانی نے برجستہ جواب دیا کہ میں

معذرت کرنے کے لیے تیار ہوں مگر آپ اجلاس دوبارہ بلائیں تو میں اپنے الفاظوں پر معذرت کروں گا ایسا بولتے ہی جسٹس صاحب وہاں سے چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد 1981ء میں اس شرط پر عدلیہ بھیج دیا کہ تم کو پی سی او کے تحت حلف لینا ہے مگر انہوں نے پی سی او کے تحت حلف لینے سے انکار کر دیا اور اپنے گھر آ گئے تاریخ جسٹس کے ایم صمدانی کو سنہری الفاظ میں آج بھی یاد کرتی ہے۔

اعترافِ جرم

چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو کا قتل سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ کا اعتراف جرم جن ججوں نے انہیں پھانسی کی سزا سنائی انہیں قبروں سے نکال کر مقدمات چلائے جائیں ۔انہوں نے وہ ظلم کیا جس کی سزا پاکستان آج تک بھگت رہا ہے۔

بھٹو کے عظیم کارنامے

عوام کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہنے والا قائد عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو کے کیے گئے تاریخی اور عظیم کارنامے۔

ایٹم بم دیا۔ دستور دیا۔ سٹیل مل دی۔ گوادر پورٹ دیا۔

ٹیکسلا آرمز فیکٹری دینے 90 ہزار جنگی قیدی آزاد کروائے۔

جمہوریت کا نعرہ دیا۔ شناختی کارڈ گرین پاسپورٹ دیا۔

بیرون ملک روزگار دیا۔ فیصل مسجد بنوائی۔

پی۔ٹی۔وی دیا۔

یوٹیلٹی سٹور دیے۔

محنت کش 15 گھنٹے کے بجائے 8 گھنٹے دھاڑ دی۔

مزارعین کو حقوق دیے۔

بے گھروں کو چھت دی۔

تمام شہریوں کو ووٹ کا حق دیا۔

عوام کو شعور دیا۔

سامراج کو بارہا شکست دی۔

مسئلہ کشمیر کو سلامتی کونسل میں اٹھایا۔

اداروں کو مضبوط کیا۔

ختم نبوت کو اسمبلی سے متفقہ منظور کرا کر دستور میں شامل کیا۔

پاکستان کو ایک مضبوط ایٹمی طاقت بنایا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کو بنایا۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئینی نام تجویز کیا۔

جمعہ کی سرکاری چھٹی دی۔

اسلامی سربراہی کونسل کی میزبانی کی۔

اسلامی سربراہی کونسل کے تاحیات چیئرمین بنے۔
اسلامی ممالک کو عالمی سامراج کے ناپاک عزائم سے باخبر کیا۔
اسلامی بلاک، اسلامی اتحادی فوج اور اسلامی سلامتی کونسل نیٹو کا فارمولا دیا۔
عالم اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔
امریکہ سے برابری کی سطح پر تعلقات رکھے۔
پاک چین دوستی کی بنیاد درکھی۔
روس سے تجارتی معاہدے کیے۔
مڈل ایسٹ سے دوطرفہ تجارت کو فروغ دیا۔
مختصر عرصے میں لاتعداد کٹھن اور مشکل ترین کارنامے سرانجام دیے۔
جیے بھٹو۔ بھٹوازم زندہ باد۔ جیے بھٹو صدا جیے

لازوال دوستی

بھٹو صاحب اور جمعہ فقیر کی دوستی کی ہوشربا داستان۔

''میری بھٹو صاحب سے محبت یا عقیدت اس وجہ سے نہیں کہ وہ کوئی عظیم قسم کے کلاسکل سوشلسٹ یا مارکسٹ تھے البتہ یہ ضرور ہے کہ ان میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک اچھے سوشلسٹ میں ہونی چاہییں۔اسی کو بھٹوازم کہتے ہیں۔اس فرق کو سمجھے بغیر آپ بھٹو صاحب کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ہمارے بائیں بازو کے اچھے خاصے دانشور اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔''

میں نے بھٹو صاحب کے چالیسویں کے موقع پر ان فقیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔اس دن

گڑی خدا بخش میں بھٹو صاحب کے مزار پر عوام کا بے پناہ رش تھا۔جس کی وجہ سے میں اس فقیر کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دے سکا۔آج صبح یہ پوسٹ میری نظروں سے گزری تو اس فقیر کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔جس دوست نے اس کو فیس بک پر پوسٹ کیا ہے اس کو کل میں نے کسی بات کی وجہ سے ان فرینڈ کیا تھا۔اس کے بعد اس نے اپنا تعارف کرایا اور مجھ سے اپنی کوتاہی پر معذرت کی۔آج اتفاقاً اس نوجوان کی پوسٹ میری نظر سے گزری۔اس سندھی سے اردو میں ترجمہ شدہ متن سے کچھ غلطیاں میں نے نکال دی ہیں اور اگر مجھے اس کا مکمل متن مل جائے تو میں اس پر مزید تحقیق کرنے کی کوشش کروں گا۔

ایک دوستی کی داستان ۔دوستی عام ہے لیکن اے دوست! دوست ملتا ہے بڑی مشکل سے ۔ لاڑکانہ میں لوگوں کو آج بھی ذوالفقار علی بھٹو اور ایک فقیر صفت درویش شخص جمعہ فقیر کی دوستی یاد ہوگی ۔یہ واحد شخص تھا جو بھٹو صاحب سے مذاق بھی کرتا تھا اور طنزیہ جملے بھی کستا تھا، جمعہ فقیر سومرو ذات کا تھا اور تعلقہ قمبر کے ایک گاؤں کورسلیمان کا باسی تھا مگر قمبر چھوڑ کر لاڑکانہ میں رہنے لگا۔درویش قسم کا فقیر تھا اکثر لاڑکانہ کی گلیوں اور رستوں پر اپنے گدھے کے ساتھ نظر آتا تھا۔ جمعہ فقیر کا یہ معمول تھا کہ وہ روزانہ گوشت مارکیٹ جاتا اور وہاں ذبح کیے گئے تمام جانوروں کی باقیات اپنے گدھے کے گودھڑوں میں ڈالتا اور پھر لاڑکانہ کے آوارہ کتوں کو وہ یہ چھیچھڑے اور باقیات کھلاتا اس طرح وہ کتے بھی جمعہ فقیر کے گرویدہ ہوگئے ۔ جہاں فقیر جاتا اس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ذوالفقار قادری کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار اسے ایک چائے کا کپ دیا تو کہنے لگا کس خوشی میں چائے پلا رہے ہو تو قادری صاحب نے کہا کہ فقیر امام کی سبیل ہے تو جمعہ فقیر نے کہا اماموں سے کیسا حساب لا دے ۔اپنی دھن میں مگن فقیر کی باتیں صوفیانہ رنگ میں رنگی ہوتی تھیں ۔ایسی گفتار عام آدمی سے ممکن نہیں تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو سے ان کی دوستی کا تعلق اس وقت قائم ہوا جب بھٹو صاحب وزیر خارجہ تھے ۔جمعہ فقیر کوئی خود چل کر المرتضی نہیں گیا تھا۔ بلکہ بھٹو صاحب خود چل کر اس فقیر کے پاس اسے دوست بنانے گئے تھے۔قصہ کچھ یوں ہے کہ کسی نے بھٹو صاحب سے کہا کہ لاڑکانہ میں ایک فقیر ایسا ہے جس کی باتوں میں دانائی چھپی ہے تو بھٹو صاحب کو بہت تجسس ہوا اور انہوں نے فقیر کو اپنے

گھر لانے کے لیے کارندوں کو بھیجا۔ جب کارندوں نے اسے کہا کہ بھٹو صاحب آپ کو بلا رہے ہیں تو اس نے کہا میں کوئی بھٹو کا نوکر ہوں جاؤ میں نہیں جاتا ان کے پاس۔ بھٹو صاحب کو جب نوکروں

نے بتایا کہ وہ ایسا کہہ رہا ہے تو بھٹو صاحب اسی وقت گاڑی میں بیٹھ کر فقیر کو ملنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ جمعہ فقیر اس کو کینیڈی مارکیٹ میں ایک پیپل تلے اپنے گدھے کو گھاس کھلانے میں

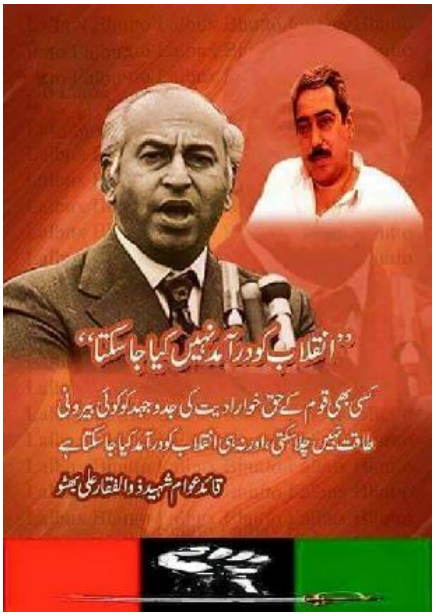

مشغول ملا۔ بھٹو صاحب گاڑی سے اترے اور فقیر کے پاس پہنچے۔ فقیر نے دیکھتے ہی کہا بھٹو صاحب کیسے بھول پڑے ہو؟ تو بھٹو صاحب نے جواب دیا فقیر حاضری کے لیے آیا ہوں۔ فقیع

نے جواب دیا کہ میں کوئی استاد ہوں جو حاضری بھرنے میرے پاس آئے ہو۔بھٹو صاحب نے کہا ۔چلیں یار دوستی کر لیتے ہیں۔ جمعہ فقیر نے کہا دوستی رکھنا آسان ہے نبھانا مشکل۔اسپر بھٹو صاحب نے کہا تم دوستی کر کے تو دیکھو۔ باقی تم مرضی کے مالک ہو۔اپنے گدھے کے ساتھ بیٹھے جمعہ فقیر نے کہا کہ میرے در پر چل کے آئے ہو یوں خالی ہاتھ لوٹا نا مناسب نہیں اور اس طرح گلیوں میں گھومنے والے فقیر کی ذوالفقار علی بھٹو سے دوستی ہوگئی۔ جمعہ فقیر سے بھٹو صاحب کبھی کبھار وقت نکال کر ملنے آتے رہے اور یوں دونوں کی دوستی پروان چڑھنے لگی۔ جب بھٹو صاحب پاکستان ک وزیر اعظم بنے تو المرتضی کو وزیر اعظم ہاؤس کا درجہ دے دیا گیا۔وزیر اعظم بننے کے بعد بھٹو صاحب فقیر سے ملنے آئے اور کہا میرے حق میں دعا کرو۔فقیر نے کہا لگتا ہے وزیر اعظم بننے پر خوش نہیں ہو۔چلو اب ایک کام کرتے ہیں تم میرے گدھے پر بیٹھ کر جمعہ بنو میں بھٹو بنتا ہوں۔بھٹو صاحب نے کہا مجھے منظور ہے مجھے اپنا گدھا دو۔اس موقعہ پر کئی وزیر مشیر موجود تھے جو یہ ساری گفتگو سن رہے تھے۔اچانک فقیر نے کہا بھٹو میں تجھے اپنا گدھا نہیں دوں گا میرے پاس بس یہ ایک ہی گدھا ہے تمہارے پاس پہلے سے ہی بہت گدھے موجود ہیں۔ پہلے انہیں سنبھال لو یہ سنتے ہی بھٹو صاحب کی بے اختیار ہنسی نکل گئی اور ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے۔اس وقت وہاں پر موجود سارے افسران کے چہرے دیکھنے کے قابل تھے۔

بھٹو صاحب وزیر اعظم بننے کے بعد جب بھی لاڑکانہ آتے تو وقت نکال کر فقیر سے ملنے ضرور آتے۔ جمعہ فقیر کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں تھا۔بس بھٹو صاحب پتہ کرتے کہ فقیر کہاں ملے گا تو وہاں پہنچ جاتے۔ جمعہ فقیر کا آخری ٹھکانہ قبرستان میں بنی ایک جھونپڑی تھی بھٹو

صاحب نے فقیر سے کہا میں تمہیں گھر بنوا کے دیتا ہوں فقیر بہت جلال میں آ گیا اور کہنے لگا آج بول دیا ہے آئیندہ بولا تو تمہاری میری یاری ختم۔

ایک بار بھٹو صاحب نے موئن جو دورو کے ائیر پورٹ پر اترتے ہی بولا کہ جمعہ فقیر سے ملنا ہے۔ پروٹوکول والے وہ روٹ لیں جہاں جمعہ فقیر کے ملنے کے امکانات ہوں۔ قافلہ چلا اور آخر کار جمعہ فقیر باقرانی روڈ پر اپنے گدھے کے ساتھ نظر آ گیا۔ بھٹو صاحب اس سے ملے اور کہا کہ آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ فقیر بولا ایک شرط پر کھانا ہم دونوں اکیلے میں کھائیں گے بھٹو نے پوچھا وہ کیوں۔ فقیر بولا یہ جو تمھارے ساتھ آدمی ہوتے ہیں بڑے بھوکے ہیں سارا یہ کھا لیں گے اور ہم دونوں کے حصے میں ہڈیاں ہی آئیں گی۔ بھٹو نے یہ بات سنتے ہی قہقہہ لگایا اور بولے کہ آپ کی شرط منظور ہے اور فقیر نے کہا ایک شرط اور بھی ہے سستے میں جان نہیں چھوٹے گی تم اور میں کھانا

کھائیں لیکن میرے گدھے نے کیا قصور کیا ہے۔ کیا اس کا پیٹ نہیں ہے؟ بھٹو نے کہا منظور ہے فقیر منظور ہے۔

دعوت سے ایک گھنٹہ پہلے بھٹو صاحب نے اس وقت کے ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ خالد احمد کھرل اور ایس پی محمد پنجل جونیجو کو احکامات دیے کہ جمعہ فقیر کو المرتضی لایا جائے۔ ڈپٹی کمشنر اور ایس پی نے ڈی ایس پی عنایت اللہ شاہانی سے کہا کہ جمعہ فقیر کو ڈھونڈو اور اسے پروٹوکول میں المرتضی لے کر آؤ۔ جب ڈی ایس پی جمعہ فقیر کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے تو فقیر نے اکیلے جانے سے انکار کر دیا

اور کہنے لگا ہم دونوں کی دعوت ہے۔ ورنہ جاؤ میں نہیں چلتا افسران بہت پریشان ہو گئے اور یہ بات بھٹو تک پہنچ گئی جس پر بھٹو صاحب نے کہا جیسا فقیر کہتا ہے ویسے ہی کیا جائے اور اس طرح جمعہ فقیر نے اکیلے میں بھٹو صاحب کے ساتھ دعوت کھائی اور اپنے گدھے کو بھی خوب گھاس کھلائی۔

لاڑکانہ کے اس درویش فقیر نے آخر کار 1990ء میں یہ جہاں چھوڑ دیا اور یوں ایک لازوال دوستی اپنے انجام کو پہنچی۔

سندھی سے اردو ترجمہ

بشکریہ سید فیصل رضا

''میری بھٹو صاحب سے محبت یا عقیدت اس وجہ سے نہیں کہ وہ کوئی عظیم قسم کے کلاسکل سوشلسٹ یا مارکسٹ تھے البتہ یہ ضرور ہے کہ ان میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک اچھے سوشلسٹ میں ہونی چاہییں۔ اسی کو بھٹوازم کہتے ہیں۔ اس فرق کو سمجھے بغیر آپ بھٹو صاحب کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ہمارے بائیں بازو کے اچھے خاصے دانشور اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔''

ایٹمی پروگرام کا خالق کون؟

ایٹمی پروگرام کا اصل خالق کون
چیئر مین بھٹو شہید کی پھانسی کی اصل وجہ کیا تھی اور ضیاء الحق کو ایٹمی پروگرام کا کریڈٹ؟

کبھی یہ سوچنا تم نے کیا کیا لوگو
یہ تم نے کس کو سرِ دار کھو دیا لوگو

یہ نظم اٹک سے تعلق رکھنے والے سابق سینیٹر شاعر دانشور احمد وحید اختر مرحوم کی ہے۔

تو ہراساں نہ ہوا ظلم کے ایوانوں سے
تو نے جنگ لڑی وقت کے فرعونوں سے

سے قائد عوام اے قائدِ عوام

زندہ ہے بھٹو

رضا زیدی

سیدھی بات ہے جو موت کو، امیر المومنین علیؑ کی سنت پر دلیری سے عمل پیرا ہوتے ہوئے ۔کامیابی سمجھ کر گلے سے لگائے وہ بھٹو بن جاتا ہے۔اس کی زندگی کا مذاق اڑانے یا جلنے والے جلتے جلتے

مر

جاتے ہیں۔مٹ جاتے ہیں اور بھٹو گردشِ لیل ونہار کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی، اپنے وجود اور اپنی خوشبو محسوس کراتا رہتا ہے۔۔۔۔زندہ ہے بھٹو جلنے والے دفع دور رہیں۔

جب تک سورج رہے گا

بھٹو تیرا نام رہے گا

یہ شخص ایک شکست خوردہ ملک کا سربراہ تھا۔سامنے والی خاتون فاتح تھی اور اس کی قید میں اس شخص کی نوے ہزار سپاہ تھی اور اس کی زمین کا خاطر خواہ حصہ اس خاتون کے قبضے میں تھا۔پھر بھی اس شخص کے چہرے پر اعتماد اطمینان اور اس کی بدن بولی دیکھیے۔ایک شکست خوردہ ملک کا صدر

مذکرات کی میز پر وہ سب کچھ جیت گیا جو ہم میدانِ جنگ میں ہار چکے تھے۔

بھٹو کا خطاب

چیئر مین بھٹو شہید شملہ معاہدے کے بعد عوام کے بہت بڑے اجتماع سے خطاب ۔نوے ہزار جنگی قیدیوں کی واپسی پانچ ہزار مربع کلومیٹر علاقہ واپس لیا جس پر رہنے والے دس لاکھ لوگ بے گھر ہو چکے تھے ان کی گھروں کو واپسی ہوئی لیکن جنہیں قید سے چھڑا کر لائے انہوں نے انعام میں تختہ دار کی زینت بنا دیا۔

عوامی سوٹ شلوار قمیض

چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو شہید سے پہلے شلوار قمیض کو آپ کسی بڑے ہوٹل اور مخصوص کلبوں میں پہن کر نہیں جا سکتے تھے وہاں

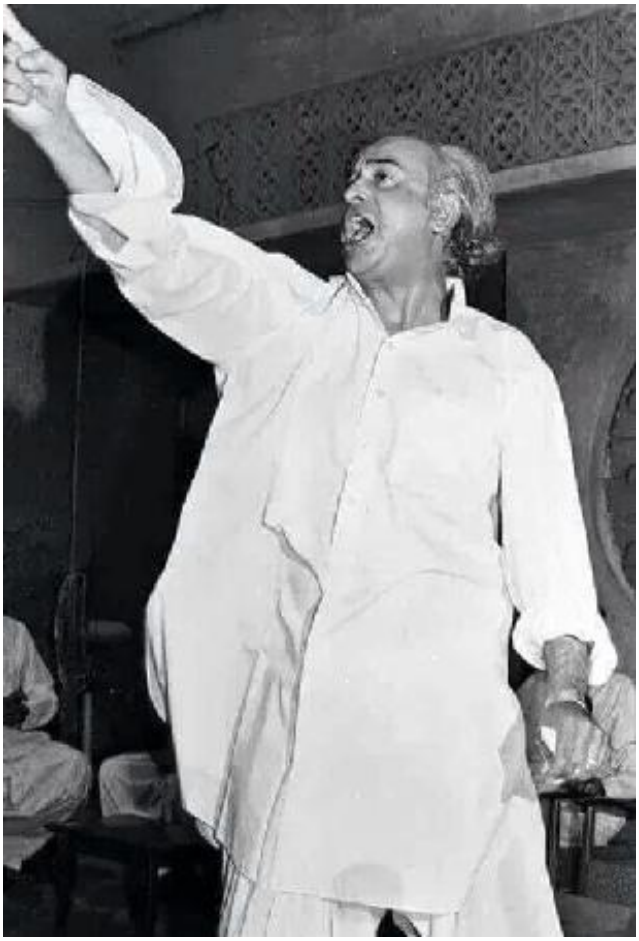

صرف سوٹ پہن کر ہی جایا سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ 1989ء پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں پاکستان پیپلز پارٹی کی کوئی تقریب تھی وہاں جب ہم پہنچے تو پارٹی کارکنان میں پیلز لیبر بیورو کے مزدور رہنماؤں اور کارکنوں کی بھی خاصی تعداد تھی جو پرانے کپڑوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔تو میں نے دوستوں سے کہا یہ پاکستان پیپلز پارٹی کا خاصہ ہے کہ یہاں آپ سوٹڈ بوٹڈ لوگ ہی نہیں عام کپڑے پہنے مزدور بھی نظر آئیں گے اور ان کو وہی عزت و وقار ملتا ہے جو ایک تھری پیس پہنے شخص کو عزت ۔انہیں چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو شہید نے دی۔ چند دن پہلے پورٹ قاسم کراچی میں پیلز لیبر بیورو کی

لیبر یونین کی جیتنے کی خبر سنی تو ایسا لگا کہ کسی قومی اسمبلی کی بڑی سیٹ سے معرکہ سر ہوا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی بنیادی طور پر مزدوروں کسانوں پسے ہوئے طبقات کی جماعت ہے۔

اقتدار اور اسیری

ذوالفقار علی بھٹو شہید نے صرف چار سال اور بیس دن سیاست جبکہ پانچ سال، چھ ماہ اور پندرہ دن حکومت کی جس کے بعد پھانسی کی سزا ہوئی۔تحریک،قتدار اور اسیری کا یہ کل دورانیہ بارہ سال اور پانچ دن ہے۔نواز شریف کو سیاست میں تیس برس گزر چکے ہیں۔مولانا فضل الرحمن کو سینتیسواں سال ہے اور عمران نیازی کو بائیس سال۔

ذوالفقار علی بھٹو شہید کو پھانسی دینے والے ڈکٹیٹر کو بھی قتدار کے گیارہ سال ایک ماہ اور بارہ دن ملے مگر ان میں سے کوئی بھی ذوالفقار علی بھٹو شہید کا متبادل نہ بن سکا۔اب یہ بھٹو کا کرشمہ ہے یا بھرپور طاقت اور وقت ملنے کے باوجود متبادل بننے کی کوشش کرنے والے لیڈروں کی نااہلی کہ بھٹو زندہ ہے۔

دنیا کی تاریخ میں بہت کم ایسے لیڈر ہیں جنہوں نے اتنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں ۔ایسا صرف مذہبی تحریکوں میں ممکن ہوا ہے یا بھٹو نے ممکن کر دکھایا ہے۔بھٹو ضدی تھا۔اسے جب تک تسلیم نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنی جنگ جیت یگا ۔کہیں لکھ کر رکھ لیں وہ مرنے والا نہیں ۔ذوالفقار علی بھٹو شہید نے کہا تھا کہ آخری قہقہہ عوام کا ہوگا۔

مجھے لگتا ہے کہ پاکستان کے عوام ادھر وہ قہقہہ لگائیں گے اور ادھر بھٹو آنکھ مار کر مر جائے گا ۔ذوالفقار علی بھٹو شہید صرف پاکستان پیپلز پارٹی کی پراپرٹی نہیں ہے بلکہ یہ پاکستان کی پراپرٹی بھی ہے۔وہ ہمارا منتخب وزیر اعظم تھا۔ہمیں دوسرے خطوں سے ہیروز امپورٹ کرنے پڑتے ہیں۔بھٹو

ہمارا وہ مقامی

ہیرو ہے جسے

ہم دنیا میں

ایکسپورٹ کرتے ہیں۔

اٹل بہاری واجپائی بھی جب پاکستان آیا تھا تو اس نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا تھا کہ بھٹو صاحب شیروانی کہاں سے سلواتے ہیں۔ہارورڈ یونیورسٹی کا بھٹو لیڈرشپ پروگرام ہو یا دنیا بھر میں بھٹو صاحب سے منسوب یادگاریں۔یہ پاکستان کا اعزاز ہیں۔دنیا میں اگر کوئی پاکستان کے بارے میں جاننا چاہتا ہے تو وہ سب سے پہلے بھٹو خاندان کو پڑھتا ہے۔ذوالفقار علی بھٹو شہید ہمارا حوالہ اور تعارف ہیں۔کردار کشی،انکار،الزامات اڑتیس برسوں سے مسلسل لگ رہے ہیں۔مگر بھٹو کا بال بیکا نہ ہوا نہ اس کی بیٹی کا۔ان دونوں کا قتل اس بات کا اظہار ہے کہ بھٹو کے دشمنوں کے پاس کوئی اور چارہ نہیں رہا تھا۔

موجودہ پاکستان پیپلز پارٹی کے اگر اقدامات غلط اور کارگردی بری ہے تو اس سے ذوالفقار علی بھٹو شہید کا کوئی تعلق نہیں اور یہ بھی لفافہ صحافیوں کا شاخسانہ ہے جنہوں نے مال لے کے پیپلز پارٹی کو بدنام کرنے کی کوشش کی کہ ان کے پاس اتنا مال کہاں سے آ گیا۔ آپ سچ لکھنے والوں کی ہسٹری دیکھ لیں قلم کی حرمت پر مر مٹنے والوں کی زندگی کے اوراق پھرول لیں وہاں آپ کو زندگی تنگدست ملے گی ۔ یہودی اور ہندوؤں کی لابی نے یہاں فنڈنگ کی اور ان کو مال دے کر قلم کی حرمت کو خریدا اور بدنام کروایا ارلوگوں کو گمراہ کروایا۔ وہ اس قول پر عمل پیرا رہے کہ جھوٹ کو اتنا بولو کہ لوگ اس کو سچ سمجھنے لگیں اور ایڈورٹائزنگ پر اتنا مال خرچ کر مٹی سونے سے مہنگی بکے۔

ہماری سیاست اگر گندی ہوگئی ہے تو اس کی سزا اپنے ہیرو کو دینا غلط ہوگا۔ بھٹو غریب کی امید ہے۔ امید کا یہ دیا جلتا رہے گا اور بھٹو غریبوں کے قہقہے تک زندہ رہے گا اور غریبوں کے قہقہے روٹی کپڑا اور مکان اور بنیادی ضروریات زندگی صاف پانی مفت علاج اور تعلیم کی فراہمی پر ہی نکلے گا تو تب تک بھٹو اور بھٹوازم زندہ رہے گا۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا۔۔۔۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں
میرا قائد میرا امیر

فخر کا مقام

فخر کا مقام اس وقت تھا جب بھٹو شہید کی قیادت میں سب عرب رہنما پاکستان تشریف لائے تھے اور سب بادشاہ بھٹو کے ساتھ فرش پر تشریف فرما تھے۔

پاکستان کو ایٹمی قوت بنانیوالے عظیم رہنماؤں کو سلام

الطاف عباسی جب ہالینڈ گئے تو ڈاکٹر قدیر خان صاحب کا کہنا تھا کہ پاکستان میں ایک سوئی لینے کے لئے مجھے دس مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کام (ایٹم بم بنانے) کے لئے بہت پیسا چاہیے، اس لئے بھٹو صاحب سے کہیں یہ پاکستان کے بس کی بات نہیں اور اگر وہ واقعی یہ مہم سر کرنا چاہتے ہیں تو ابتدائی طور پر پہلے سو ملین ڈالر کا بندوبست کریں جو اس عظیم پروجیکٹ کے لئے سیڈ منی ہوگی۔ یہ اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی جس کا انتظام اس وقت بہت کٹھن تھا چنانچہ ذوالفقار علی بھٹو نے الطاف عباسی کو کرنل قذافی کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اگر ہمیں 100 ملین ڈالر ملے اور ہم بھارت کے جواب میں ایٹم بم نہ بنا سکے تو پاکستان صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔ چنانچہ کرنل قذافی نہ صرف اتنی بڑی رقم دینے پر آمادہ ہوگئے بلکہ انہوں نے لیبیا کی انقلابی کمان کونسل کے ممبر ڈاکٹر سالم بن عامر کو یہ رقم دے کر الطاف عباسی کے ہمراہ ہالینڈ بھیجا۔ الطاف عباسی کے بقول، پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے لئے اگر اس وقت قذافی پیسے نہ دیتا تو پاکستان آج ایٹمی طاقت نہ ہوتا۔ مگر یہ تاریخ کا جبر ہے کہ بھٹو پھانسی پر جھول گیا، ڈاکٹر قدیر خان نظر بند رکھے گئے

بھٹو کا خوف

اسٹیبلشمنٹ پر آج بھی بھٹو صاحب کا خوف طاری ہے۔ بھٹو اپنے انتخابی نشان تلوار کی طرح مخالفین کے اعصاب پر چھایا ہوا ہے۔ مخالف بھٹو کی سوچ سے اس لیے بھی ڈرتے ہیں کہ یہ سوچ آج بھی زندہ ہے۔ لاکھوں لوگ بھٹو شہید کے مزار پر آتے ہیں اور ایک نئی طاقت لے کر واپس جاتے ہیں۔

انمول قائد

بس تو کتنا انمول ہے.....بھٹو صاحب نے ڈی ایس پی راولپنڈی کی طرف دیکھا اور پوچھا ''میرا نام کیا ہے'' ڈی سی نے جواب دیا ''سر آپ ذوالفقار علی بھٹو ہیں'' اور بھٹو صاحب نے پوچھا میرے والد کا کیا نام تھا۔ ڈی سی نے جواب دیا ''سر ان کا نام سر شاہ نواز بھٹو تھا'' اور بھٹو نے کہا قابض جنرل کا کیا نام ہے۔ ڈی ایس پی نے جواب دیا ''جنرل ضیاء الحق'' بھٹو صاحب بولے ''تو اب اس قابض جنرل کے والد کا نام بتاؤ'' ڈی ایس پی نے ادب سے عرض کیا ''سر میں نہیں جانتا'' بھٹو صاحب بولے ''اور تم یہ چاہتے ہو کہ سر شاہ نواز بھٹو کا بیٹا ذوالفقار علی بھٹو کسی نامعلوم مولوی حق کے قابض بیٹے جنرل ضیاء الحق سے بھیک مانگے۔

سیلوٹ فار فاؤنڈر آف اٹامک پاکستان

سیلوٹ فار فاؤنڈر آف مسلم نیشنز یونیٹی

سیلوٹ فار فاؤنڈر آف اسلامک ورلڈ بنک

سیلوٹ فار بھٹو

فکرِ بھٹو

طبقاتی کشمکش نا قابل مصالحت ہے اس کا نتیجہ کسی ایک طبقے کی شکست کی صورت میں نکلے گا

۔شہید ذوالفقار علی بھٹو

ایٹمی دھماکے

عمران قادری

ہندوستان نے جب راجستھان کے علاقے میں جب ایٹمی دھماکے کیے اور سیکورٹی کونسل کی مستقل نشست کے لیے پر تولنے لگا تب وطن عزیز پاکستان نے ایک ذوالفقار علی بھٹو کو جنم دے رکھا تھا.....جن کی نظروں نے اس وقت خطے میں بھارت کی چودھراہٹ کا خواب بھانپ لیا تھا۔

صد شکر کہ اس وقت جب 1971ء کی جنگ کا ٹائیگر نیازی ہندوستانی جنرل کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی تقریب میں دستخط کر رہا تھا۔ان کی پتلونیں آج بھی ہندوستانی نمائش میں لٹکی ہوئی ہیں مگر جنرل نیازی کے ساتھ قید نوے ہزار پاکستانی افواج کو ذوالفقار علی بھٹو جہاں ہندوستان سے آزاد کرالایا وہاں ایک شکست خوردہ قوم اور ملک کا وقار بحال کرنے کا عزم لیے ذوالفقار علی بھٹو عملی جدوجہد میں تھا ساتھ ہی خطے میں ہندوستانی چودھراہٹ کا راستہ روکنے کے لیے اس نے پاکستان میں ایٹم بم کی بنیاد رکھی۔

عجیب لیڈر تھا قوم سے چندے نہیں مانگے نا ہی قوم کو مہنگائی کے سمندر میں دھکیلا بلکہ قوم

کے لیے عربوں میں رزق کے دروازے کھولے ہر پاکستانی کو پاکستان کے امراء کے مقابل لا کھڑا کیا۔صد خدا کا شکر اس وقت پاکستان میں عمران نیازی جیسا کوئی لیڈر نہیں تھا جو بزدل آج بھی سرکاری طور پر ہندوستان کے احترام میں یوم تکبیر منانے سے قاصر ہے۔ذوالفقار علی بھٹو نے اس وقت ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے مایوس پاکستان میں ہندوستان کی چودھراہٹ تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔

تاریخ میں درج ہے کہ امریکہ کے یہودی وزیر خارجہ کسنجر کے وہ الفاظ جو اس نے پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو کو مخالفت کرتے ہوئے کہا تھے۔

''اگر تم نے ایٹم بم کے متعلق اپنا ارادہ نہ بدلا تو ہم تمہیں عبرت ناک شکست دیں گے''

پھر ذوالفقار علی بھٹو کا ناشا ہنواز رہا نہ مرتضی اور نہ بے نظیر رہی۔ہاں مگر دنیا کی تاریخ میں اقوام کی کتاب میں عوام کی روح میں ذوالفقار علی بھٹو بن کر امر ہو گیا۔دنیا کے اخبارات میں میگزینوں میں نصاب میں جنوبی ایشیا سے جو نام سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور سنا گیا وہ پاکستان کا بھٹو ہے۔

بھٹو صاحب کو سامراجی ایجنٹوں نے قبر میں پہنچا دیا مگر وہ قبر سے بھی حکومت کرنے کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔آج جو ہندوستان سمیت عالمی جارحیت سے یہ بائیس کروڑ پاکستانی محفوظ ہیں تو یہ صرف اس خون کا صدقہ ہے جو راولپنڈی میں بہایا گیا۔بھٹو پاکستان کا لافانی نظریہ ہے جو ہر باشعور

پاکستانی اس کا پرچار کرتا ہے۔

اے قائدِ عوام تجھے لاکھوں سلام

معافی نامہ

ذوالفقار علی بھٹو جیل میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے کہ ڈپٹی کمیشنر سعید مہدی نے اندر داخل ہو کر سلام کیا۔ بھٹو نے اوپر کی طرف دیکھ کر پوچھا کیوں آئے ہو؟ سعید مہدی نے کہا سر معافی نامے کے کاغذات لایا ہوں اس پر دستخط کر دیں۔ بھٹو نے کاغذ اپنے ہاتھ میں لیے اور پوچھا یہ کس نے بھیجا ہے۔ سعید مہدی نے جواب دیا جنرل ضیاء الحق نے۔ بھٹو نے مسکراتے ہوئے پوچھا مجھے جانتے ہو۔ سعید مہدی نے جواب دیا ''سر آپ کو کون نہیں جانتا۔ آپ ذوالفقار علی بھٹو ہیں۔ بھٹو نے

پوچھا میرے باپ کو جانتے ہو اس نے کہا سر بالکل سر شاہنواز بھٹو کو بھی سب جانتے ہیں۔ بھٹو نے اوپر دیکھ کر پوچھا جنرل ضیاء الحق کے باپ کو جانتے ہو سعید مہدی نے نفی میں سر ہلا کر no sir بھٹو نے اس اسے کاغذات واپس دیتے ہوئے کہا جاؤ اسے کہو جس کے باپ کا کچھ پتہ نہیں ذوالفقار علی بھٹو اس سے معافی کی درخواست کیسے کر سکتا ہے۔

غریب پاکستانیوں کے لیڈر قائد عوام کا جنم دن

5 جنوری 1928ء ذوالفقار علی بھٹو کا جنم دن ہے۔ ایک ایسا باصلاحیت انسان جسکی ذہانت، ویژن اور دلیری کو دنیا کے بڑے بڑے لیڈروں اور قوموں نے تسلیم کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک سیاسی لیڈر اور مفکر تھے۔ جس نے اپنی سوچ پر عمل کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مسیحا صفت انسان نے مری ہوئی شکست خوردہ قوم کو زندہ کر دیا اور صرف چار برسوں میں پاکستان کو سپر پاور کے برابر لا کھڑا کر دیا اور نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ عالمی سطح پر استعماری قوتوں کے سامنے پوری طاقت کیے

ساتھ کھڑا ہو گیا۔اس دیوتا کو عالمی استعمار قتل نہیں کر سکتے تھے لیکن وطن کی وردی پہن کر اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے غدار وطن وملت اسلامیہ جنرل ضیاء الحق نے عالم اسلام کے نجات دہندہ ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کر دیا.....مسلمانوں کے اس ہیرو اور مسیحا کے قتل میں مولویوں نے شیطانی کردار ادا کیا۔تاریخ میں کمال مماثلت پائی جاتی ہے۔امام حسین کو شہید کرنے والے یزید کو بھی 18000 مولویوں کے فتاوی جات کی مدد حاصل تھی۔سلطان باھو فرماتے ہیں۔

اٹھارہ ہزار جو عالم آہا اگے حسین سے مردے ھو

اس طرح ذوالفقار علی بھٹو کے قتل میں بھی ہزاروں مولویوں نے حصہ لیا۔چونکہ بھٹو بیسویں صدی کا ایک دیو مالائی وطن پرست لیڈر تھا اس لیے اس کے کردار کی مماثلت بھی یونانی دیو مالا کا ایک کردار پرومیتھس ہے۔جو سب سے بڑے دیوتا زیوس کو چکر دے کر عالم بالا سے آگ چرا لایا اور تاریکی دور کر دی۔سائنس اور پیداوار شروع ہو گئی۔اس جرم کی پاداش میں دیوتا زیوس نے پرمیتھس دیوتا کو ایک چٹان کے ساتھ اس کے وجود میں کیلیں اتار کر باندھ دیا اور ایک گدھ چھوڑ دیا۔جو ہر روز پرومیتھس دیوتا کے دل میں ٹھونگے مار کر اسے کھاتا تھا لیکن دوسرے دن وہ دل پھر پورا ہو جاتا تھا۔بالکل ذوالفقار علی بھٹو کی طرح جیسے امریکی دیوتا زیوس کا گدھ پاکستانی بھٹو دشمن بھٹو کو ختم کرنا چاہتے ہیں لیکن اسے موت نہیں آتی۔ذوالفقار علی بھٹو کا جنم دن قیامت تک جاری وساری رہے گا چونکہ وہ ختم نبوت کا ایک لافانی کردار ہے۔

جب تک سورج چاندر ہے گا　　بھٹو تیرا نام رہے گا

کیا آپ کو معلوم ہے قائد عوام کے ہمراہ یہ نوجوان لڑکا بوڑھا ہو چکا ہے اور اس کا جوان بیٹا سانحہ کارساز کراچی میں بینظیر بھٹو شہید کے محافظوں کے ساتھ شہید ہو گیا اور گڑھی خدا بخش کے شہیدوں کے قبرستان میں ابدی نیند سو رہا ہے۔

یہ ہیں پاکستان پیپلز پارٹی کے جیالے

بھٹو کا ایٹمی پروگرام اور ھینری کیسنجر کی دھمکی

اگست 1976ء میں امیریکن وزیر خارجہ ڈاکٹر ھینری کیسنجر بھٹو صاحب کو ایٹمی پروگرام ختم کرانے کے لیے پاکستان آئے اور بھٹو صاحب کو بہت سمجھایا کہ ایٹمی پروگرام سے دست بردار ہو جاؤ ورنہ نقصان میں جاؤ گے جس پر بھٹو صاحب نے کیسنجر سے کہا سکندر یونانی جسے آپ الیگزینڈر دی گریٹ کہتے ہیں وہ دنیا فتح کرنے نکلا تھا لیکن جب وہ سرزمین سندھ میں داخل ہوا تو یہاں کے مکینوں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔آخر کار وہ بیمار ہوا اور مایوس ہو کر لوٹ گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا فیصلہ تو دس اگست 1976ء کو ہی کر لیا گیا تھا۔جب امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہینری کسنجر اپنی بیوی کے ساتھ پاکستان آیا تھا جس کے اعزاز میں اس وقت کے پنجاب کے گورنر نواب صادق قریشی نے شاہی قلعہ لاہور میں تیس مخصوص آدمیوں پر مشتمل دعوت کا اہتمام کیا تھا۔فریدہ خانم غزل گوئی میں مشغول تھیں کہ کیسنجر نے بھٹو صاحب کو بولا۔

"Mr,Bhutto,we will run rail road engie over you"

جس پر بھٹو صاحب نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔

"When the time will come,we wil see to that also"

وہ رات بھٹو صاحب کے لیے اہم تھی۔محفل کے ختم ہونے کے بعد ڈنر سے پہلے بھٹو صاحب نے تقریب سے خطاب کیا۔

دورہ فرانس

بھٹو صاحب فرانس کے دورے پر گئے تو صدر اسکارڈ اسٹینگ نے پیرس کے مضافات میں اپنے فارم ہاؤس پر ان کے اعزاز میں ایک پرائیویٹ عشائیہ کا انتظام کیا جس میں دونوں سربراہوں کے خاندانوں سمیت چند دوسرے قریبی احباب شریک تھے۔ یہ ورکنگ ڈنر کے بجاء ایک فیملی گیٹ ٹوگیدر جس کا مقصد تفریح اور خاندانوں کے درمیان روابط پیدا کرنا تھا۔ کھانے کے بعد اسٹینگ اور بھٹو فارم ہاؤس پر چہل قدمی کے لیے نکلے تو راستے میں جگہ جگہ بتیاں روشن دیکھ کر بھٹو صاحب نے کہا ''جناب صدر آپ کے ملک میں بجلی وافر مقدار میں پیدا ہوتی ہے'' مضافات میں بھی روشنی ہے۔ اسٹینگ نے کہا ''ہم پن بجلی کے ساتھ ساتھ ایٹمی بجلی بھی پیدا کر رہے ہیں۔ بجلی وافر ہے لیکن ابھی تک ان مضافات میں بجلی نہیں پہنچا سکے۔ یہاں ایک جنریٹر کی مدد سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ ان دنوں جنریٹر عام نہیں تھے۔ بھٹو صاحب نے دیکھنے کا اشتیاق ظہار کیا۔ صدر انہیں لے کر جنریٹر روم میں چلے گئے جو اتفاق سے قریب ہی بنا ہوا تھا۔ بھٹو صاحب نے جنریٹر کو بڑی دلچسپی سے دیکھا نیز اس کی کارگردی اور انجن کے بارے میں سوالات پوچھے جو آپریٹر نے انہیں بریف کیا۔ اس مشین میں بھٹو صاحب کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اسٹینگ نے کہا ''جناب ایسا ہی ایک جنریٹر آپ کے ساتھ پاکستان جائے گا جو میری فیملی کی طرف سے آپ کی فیملی کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے۔

بھٹو مسکرائے اور گرمجوشی سے شکریہ ادا کیا اور دھیرے سے بولے۔ ''جناب صدر میں ایک غریب ملک کا وزیر اعظم ہوں۔ میرے ملک میں بجلی کی بہت کمی ہے۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے انڈسٹری نہ ہونے کے برابر ہے روشنی کی کمی کی وجہ سے بہت سے طالب علم تعلیم حاصل کرنے سے رہ جاتے ہیں، مریضوں کا بروقت آپریشن نہ ہونے کی وجہ سے مریض مرجاتے ہیں۔ ٹیوب ویل نہ چلنے کی وجہ سے فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں اگر میرے گھر میں آپ کے دیے ہوئے تحفے سے روشنی ہوگی تو یہ میرے عوام کے ساتھ سخت زیادتی ہوگی۔

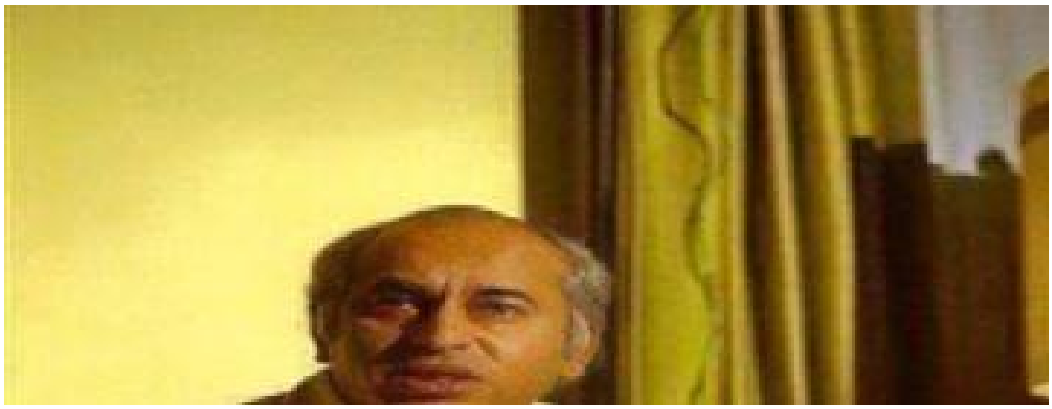

صدر اسٹینگ نے چلتے چلتے رک کے حیرت بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور فرطِ عقیدت سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کانپتی آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ وزیر اعظم بتائیں میں آپ کے ملک کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

بھٹو صاحب نے دوسرا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا، گہری نظروں سے انہیں دیکھا اور بولے جناب صدر ایک ایٹمی ریکٹر میرے ملک میں لگا دیجیے جو پورے ملک میں بجلی کی کمی پوری کر سکے۔ اسٹینگ رکا، چند لمحے سوچا اور پھر دھیرے سے بولا۔ ''جناب یہ ایٹمی ریکٹر فرانسیسی عوام کی طرف سے

پاکستانی عوام کی زندگی میں روشنی لانے کا استعارہ ہوگا۔''

دوسری صبح جو پہلا کام ہوا وہ اسی منصوبے کے معاہدے پر دستخط تھے۔اور یہ ایٹمی بجلی گھر بھٹو نے ایک ذاتی جنریٹر کے بدلے میں لیا تھا۔جو آج بھی کراچی میں کام کر رہا ہے۔

24. A written application was also later submitted to the Court by the appellant himself requesting for an opportunity to personally address the Court on some aspects of the case. This request was allowed, and, accordingly, the appellant personally appeared before the Court for four days, from the 18th to the 21st of December, 1978.

25. During his elaborate address, spreading over nearly 12 hours, appellant Zulfiqar Ali Bhutto denied the prosecution allegations regarding his having any motive to have witness Ahmad Raza Kasuri assassinated, and having entered into any conspiracy in this behalf with witness Masood Mahmood, the then Director-General of the Federal Security Force. He also contended that the evidence did not disclose the presence of an essential ingredient of the offence of conspiracy, namely, agreement, on the part of the co-conspirators, particularly Masood Mahmood, who had pleaded duress on the part of the appellant. The appellant commented upon what he called the inherent contradictions in the evidence of witnesses Ahmad Raza Kasuri and Masood Mahmood, and submitted that they were acting under the compulsion of Martial Law prevailing in the country. He stated that if the prosecution wanted the Court to take judicial notice of the alleged social conditions prevailing in Pakistan during his tenure of office as President and Prime Minister of the country, then similar notice should also be taken of the fact that important witnesses were giving evidence at the trial during the continuance of Martial Law.

26. He vehemently contended that)he entire case against him was false and fabricated, intended to eliminate him physically and politically, and that he was innocent. He bitterly complained that he had not been given a fair trial in the High Court, as its presiding Judge, Mr. Justice Mushtaq Hussain had a personal bias against him owing to his supersession for the office of Chief Justice of the Lahore High Court, and also because the Central Executive Committee of the Pakistan People's Party, presided over by the appellant, had joined issue with him in respect of certain statements made by him in his capacity as Chief Election Commissioner in August, 1977.

27. He strongly criticised the observations made by the High Court in paragraphs 609 to 616 of its judgment, describing him as a Muslim only in name and not living up to the ideals of conduct prescribed for Muslim rulers lay Islam. He submitted that this criticism was entirely unjustified, and was clear evidence of the bias of the trial Court against him ; as, in fact, he had rendered greater service to Islam than any of the previous rulers of Pakistan, as he was instrumental in solving the age-old Qadiani problem, in convening the Islamic Summit at Lahore and being elected as its Chairman on a proposal made by no less a person than the late King Faisal of Saudi Arabia ; that be had organized' Seerat Conferences in the country, had formulated a liberal Haj Policy, had declared Friday as a closed holiday instead of Sunday, had introduced prohibition in the country, had changed the name of the Pakistan Red Cross to Red Crescent ; and was primarily responsible for the unanimous adoption of the 1973 Constitution by the Parliament. He submitted that in the face of these achievements in the cause -of Islam, the High Court had no justification, nor was it competent, to pronounce upon the nature of his conduct as a Muslim. He also submitted that no head of the Government could be held responsible for individual crimes committed in the State during his tenure of office. He resented the insinuations and innuendoes contained in paragraphs 613 to 6 6 of the judgment ; which ostensibly spell out the Islamic injunctions regarding the conduct of Government by a Muslim ruler.

28. On all the four days of his appearance appellant Zulfiqar Ali Bhutto expressed his full confidence in this Court, and also his gratitude for having been given an opportunity of personally addressing the Court at length, even though his lawyers had already made full submissions on all aspects of the case.

فقیروں کا بھٹو

1968ء یا 69 کی بات ہے ذوالفقار علی بھٹو اندرونِ سندھ کے دورے سے اپنے گھر لاڑکانہ واپس جارہے تھے اور سخت بخار کی حالت میں تھے۔ان کی گاڑی ممتاز بھٹو چلا رہے تھے شہداد کوٹ اور قمبر کے نزدیک ایک مزار کے فقیروں ،ملنگوں اور درویشوں کو بھٹو کی آمد کا پتہ چلا تو انہوں نے بھٹو کی گاڑی کو وارہ پل کے مقام پر گھیر لیا۔ممتاز بھٹو نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ بھٹو صاحب کو بخار ہے مگر نہ مانے اور انہیں اپنے ساتھ آستانے پر لے جانے پر بضد رہے۔ذوالفقار علی بھٹو ان کا مطالبہ مان کر ان کے ساتھ گئے ۔وہاں فقیروں ،ملنگوں اور درویشوں نے بھٹو کو اپنے ساتھ چرس اور بھنگ پینے کی پیشکش کی۔بھٹو نے کہا آپ چائے پلا دیں۔اسی وقت ان فقیروں نے گڑ کی چائے بنا کر پیش کی اسی دوران ایک ملنگ نے درباروں والا مخصوص ہار اپنے گلے سے اتار کر بھٹو کے گلے میں ڈال دیا۔بھٹو تیز بخار کی صورت میں کچھ دیر وہاں فقیروں کے ساتھ بیٹھے اور پھر اجازت لے کر وہاں سے لاڑکانہ چلے گئے۔

ان فقیروں ،ملنگوں اور درویشوں اور ان جیسے کروڑوں لوگوں نے .....جنہیں پیپلز پارٹی مدت ہوئی فراموش کر چکی ہے،آج تک بھٹو کو اپنے دلوں میں بسایا ہوا ہے۔

زلفی بھٹو

محمد احمد ترازی

زلفی بھٹو تاریخ پاکستان کا لازوال کردار ہے۔

یہ اپریل 1945ء کی بات ہے جب تحریک پاکستان کے قائداعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں اپنے بام عروج پر تھی اور مسلمانانِ ہند کے ''لے کے رہیں گے پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان'' کے نعروں سے پورا برصغیر گونج رہا تھا۔ بچے، بوڑھے اور جوان سب کا ایک ہی مطالبہ تھا ایک آزاد وخودمختار سرزمین کا حصول جس میں وہ اپنی زندگی اپنی معاشرتی روایات اور مذہبی اقدار کے مطابق بسر کرسکیں۔ گویا حصول پاکستان مسلمانانِ برصغیر کا خواب ہی نہیں ان کی جدوجہد کی حقیقی منزل بھی تھا اس زمانے میں ایک طالب علم نے اپنے محبوب لیڈر قائداعظم محمد علی جناح کو ایک خط لکھا۔ جس میں اس نے لکھا۔ ''ڈیئر سر! صوبہ سرحد میں سیاسی صورتحال پیدا ہوئی ہے اس نے مجھے اتنا جذباتی اور برانگیختہ کردیا ہے کہ میں اپنے قائد کو اس کے متعلق کچھ لکھنے کی جرأت کررہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کے مسلمانوں کو یہ محسوس کرلینا چاہیے کہ ہندو بنیے ہمارے ساتھ کبھی مخلص ومتحد نہیں ہوسکتے وہ ہمارے قرآن پاک اور ہمارے پیغمبر کے شدید ترین دشمن ہیں۔ یہ بھی اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ آپ ہی ہمارے قائد اور رہنما ہیں۔ جناب آپ نے ہمیں ایک پلیٹ فارم اور ایک جھنڈے تلے اکٹھا کیا ہے اور ہر مسلمان کا یہی نعرہ ہے کہ ''پاکستان کی طرف بڑھو، ہماری قسمت پاکستان ہے'' ہماری منزل ومقصد پاکستان ہے۔ ہمیں آپ کی ذات میں ایک قابل رہنما مل گیا ہے۔ اب ہمیں کوئی بھی منزل مقصود کی طرف جانے سے نہیں روک سکتا۔ میں حیران ہوں کہ شیخ محمد عبداللہ اور ان جیسے ڈاکٹر خان صاحب وغیرہ اپنے آپ کو مسلمان کیسے کہتے ہیں جب کہ انہوں نے کانگریس کی پالیسیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے جب میں مسلم لیگ کے خلاف ان کی بیہودہ تقریریں پڑھتا ہوں۔ کیا وہ اتنے ہی بے خبر ہیں یا ان کی حب الوطنی کا یہی تقاضہ ہے۔ ہزاروں لاکھوں عبداللہ بھی مل کر ہم کو یقین نہیں دلا سکتے کہ ہم غلطی پر ہیں۔ اپنی ایڑھی چوٹی کا زور لگا کر بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے کیونکہ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہے کہ ہم آپ سے کس قدر متاثر ہیں اور ہمیں آپ پر کتنا فخر ہے

۔ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ابھی اس قابل تو نہیں ہوں کہ مادرِ وطن قائم کرنے کے لیے آپ کی کوئی مدد کر سکوں لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب میں پاکستان کے لیے اپنی جان قربان کروں گا''۔

بیس اپریل 1945ء کو سولہ سال کی عمر میں قائداعظم محمد علی جناح کو خط لکھنے والے نوجوان طالب علم ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ کسے معلوم تھا کہ اتنی کم عمری میں قائداعظم محمد علی جناح کو خط لکھ کر اپنی وفاداری اور ملک کے لیے جان دینے کے عزم کا اظہار کرنے والا طالب علم ایک دن پاکستان کا وزیراعظم بنے گا اور 4 اپریل 1979ء کو ایک فوجی آمر جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کر کے اپنے طالب علمی کے عہد پر ایفا کی مہر ثابت کرے گا۔ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو

5 جنوری 1928ء کو لاڑکانہ میں سر شاہنواز بھٹو کی دوسری بیوی خورشید بیگم کے ہاں پیدا ہوئے۔ جو ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ جاگیردارانہ پس منظر کی وجہ سے خورشید بیگم کو وہ عزت و احترام نہ مل سکا جس کی وہ مستحق تھیں۔ خاندانی تفاوت، ذہین وفطین بچے ذوالفقار علی بھٹو کے قلب و ذہن پر گہرا انقلابی اثر مرتسم کر گیا۔ ایک انٹرویو میں خود بھٹو صاحب اس بات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''میری والدہ ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں انھوں نے مجھے غریبوں اور مفلسوں کی تکلیفوں سے آگاہی دی۔ اس کے علاوہ جب میں والد صاحب کے ساتھ دورے پر جاتا تو غریبوں کی حالتِ زار دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتا بمبئی اور اندرونِ سندھ کے غریبوں کی معاشی حالت میں غیر معمولی فرق تھا۔ اس فرق نے افلاس کے نقوش میرے ذہن پر اور بھی گہرے کر دیے

۔'' چنانچہ بھٹو بچپن ہی سے طبقاتی اونچ نیچ ،معاشرتی ناہمواریوں اور جاگیردرانہ نظام کے خلاف ہو گئے ۔وہ اپنی آخری کتاب ''اگر مجھے قتل کر دیا گیا'' میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''1935ء میں جب میری عمر سات سال تھی میرے والد اس وقت بمبئی کی حکومت کے وزیر تھے ایک دن بمبئی کے گورنر لارڈ برابورن نے میرے والد کو تینوں بیٹوں کے ہمراہ چائے کی دعوت پر بلایا۔ جب میرے بڑے بھائی امداد علی جن کی عمر 21 سال تھی کا تعارف ہو چکا تھا تو گورنر نے بھائی کے بارے میں کہا ''کتنا خوبصورت اور جوان آدمی ہے۔امداد علی نے ایک تربیت

یافتہ ارسٹوکریٹ ہوتے ہوئے جواب دیا ''میں اپنے آپ کو بہت مسرور اور مغرور سمجھتا ہوں کیونکہ ہے جب میری تعریف ہمارے خوبصورت گورنر نے کی میری باری آئی تو میں نے باریک آواز میں کہا ''ہز ایکسی لینسی گورنر اس لیے خوبصورت ہیں ہمارے خوبصورت ملک کے خون پر پلتے ہیں برابورن میرے اس جواب پر ششدر رہ گیا تک حیرت زدہ میری طرف دیکھتا رہا اور پھر والد سے کہنے لگا ''شاہنواز اس میں تمہیں ایک

کیونکہ وہ ۔لارڈ ایک لمحے میرے شاعر اور

انقلابی ملا ہے'' بھٹو صاحب لکھتے ہیں ''یہی سب کچھ ہے جو میں ان سارے برسوں میں رہا ہوں ۔ایک شاعر اور ایک انقلابی اور جب تک میرے جسم سے آخری سانس نہیں نکل جاتی میں یہی رہوں گا'' ذوالفقار علی بھٹو کا شمار بیسویں صدی کے جنوبی ایشیاء کے عظیم انقلابی رہنماؤں میں ہوتا ہے۔وہ ایک ایسے رہنما تھے جو نا صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کے کروڑوں عوام میں بے حد مقبول تھے اور دنیا بھر بالخصوص مسلم دنیا کے سربراہ مملکت انہیں خاص محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ذوالفقار علی بھٹو بے انتہا ذہانت ،اعلیٰ سیاسی بصیرت ،لاجواب تدبر اور دوطرفہ تعلقات کے امور کے ماہر تھے۔وہ ابتداہی سے ایشیائی امور میں مغرب کی مداخلت کے کڑے مخالفوں میں سے ایک تھے بھٹو سامراج کے خاتمے ،اقتصادی آزادی ،خود کفالت کے حامی اور زندگی بھر اس مؤقف کے زبردست داعی رہے کہ کسی ملک کے اندرونی معاملے میں مداخلت نہ کی جائے بھٹو کہتے تھے ''نوآبادیاتی دور ختم ہو رہا ہے ،اب ایشیاء اور افریقہ میں نئی طاقتیں ابھر چکیں ہیں ،افریشیائی قیادت کے سامنے بنیادی مسئلہ ان کی خودمختاری کے چیلنج کا ہے۔مغرب میں ایشیائی قیادت کو جس دن برابری اور مساوات کی بنیاد پر تسلیم کرلیا گیا اس دن عالمی امن کے تقاضے پورے ہو جائیں گے'' اپنی اس انقلابی فکر کی وجہ سے وہ زندگی بھر سامراجی حلقوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے ۔1963ء میں وائٹ ہاؤس میں امریکی صدر جان کینڈی کی پاکستانی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات میں امریکی صدر بھٹو کی ذہانت اور وسعت علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے بھٹو سے کہا ''اگر آپ امریکن ہوتے تو میری کابینہ میں وزیر ہوتے'' جناب ذوالفقار علی بھٹو نے برجستہ جواب دیا ''مسٹر پریذیڈینٹ !محتاط رہیں اگر میں امریکن ہوتا تو آپ کی جگہ ہوتا'' پاکستانی نوجوان کی بلا کی ذہانت ،خوداعتمادی اور بے باکی نے امریکی صدر کو ہلا کر رکھ دیا اور اسی دن سے بھٹو کے باغیانہ خیالات کی وجہ سے امریکن خفیہ ایجنسیوں نے محسوس کرلیا تھا کہ ایک دن یہ شخص امریکہ کے لیے دردِسر بنے گا۔چنانچہ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے نام کے گرد سرخ دائرہ لگا دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو 1957ء میں 29 سال کی عمر میں پہلی بار اقوام متحدہ میں پاکستانی سب سے کم عمر رکن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔بھٹو کی خداداد ذہانت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے اسکندر مرزا نے انہیں بطور وزیر اپنی کابینہ میں شامل کرلیا۔28 اکتوبر 1958ء کو جنرل ایوب خان نے بھٹو کو اپنی حکومت میں وزیر معدنیات مقرر کرلیا اور 23 جنوری 1963ء کو وزیر خارجہ محمد علی بوگرہ کے انتقال

کے بعد جناب بھٹو کو وزارتِ خارجہ کا قلم دان سپرد کیا گیا یہ پاکستان کی آزاد خارجہ پالیسی کا نکتہ آغاز تھا۔ بھٹو صاحب کے دور میں پاکستان کی خارجہ پالیسی جن خطوط پر استوار ہوئی اور جس ماہرانہ انداز میں بھٹو صاحب اسے آگے بڑھاتے رہے۔ وہ مغربی طاقتوں بالخصوص امریکہ کے لیے دردِ سر تھا۔ 6 ستمبر 1965ء کی رات کے اندھیرے میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو اس وقت ذوالفقار علی بھٹو نے بین الاقوامی محاذ پر پاکستان کی جنگ لڑی اور چین، انڈونیشاء سعودی عرب، ایران، ترکی، عراق، مصر، اردن، الجزائر، شام، سوڈان، یمن، مراکش، لیبیا، کویت کو پاکستان کی اخلاقی اور مالی امداد پر رضامند کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پاکستان کا مقدمہ لڑتے ہوئے تاریخی تقریر کی جس کے ایک ایک لفظ سے زندگی کی حرارت اور جذبوں کی سچائی عیاں تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام عالم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم ہزار سال تک جنگ لڑیں گے'' ان کا یہ جملہ پاکستان کے عوام کے دلوں کی دھڑکن اور جذبوں کا امین تھا۔ اقوام متحدہ میں بھٹو صاحب کی تقریر نے قوم کے حوصلوں کو بلند کر دیا۔ مگر افسوس کہ جنگ کے میدانوں میں جیتی ہوئی بازی جنرل ایوب خان نے تاشقند میں مذاکرات کی میز پر ہار دی۔ 16 جون 1966ء کو بھٹو صاحب نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور 30 نومبر 1967ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھ کر ملک میں عوامی جدو جہد کا آغاز کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے سقوط ڈھاکہ کے بعد 20 دسمبر 1971ء کو باقی ماندہ پاکستان کی باگ ڈور سنبھالی وہ پاکستان کی پہلی شخصیت تھے جس کی سوچ اور فکر کے منفرد، انقلابی اور تخلیقی انداز نے ایشیائی سیاست میں انقلاب آفریں تبدیلیاں پیدا کیں۔ افریشیائی اتحاد، پاک بھارت تعلقات اور پاک چین دوستی کے متعلق بھٹو صاحب کا اندازِ فکر و عمل عالمی سامراج کے لیے زہرِ قاتل ثابت ہوا۔ جس کی وجہ سے اسے جنوب مشرقی ایشیاء میں اپنی پالیسیوں کے تسلسل میں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی وجہ سے بھٹو صاحب کو کئی بار خریدنے کی بھی کوشش کی گئی۔ ایک بار امریکی صدر جانسن نے انہیں کہا تھا کہ ''ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ تمہیں جتنی دولت چاہیے وہ دنیا کے جس حصے میں چاہو گے مل جائے گی''۔ اس موقع پر ذوالفقار علی بھٹو نے قومی غیرت اور جذبہ حب الوطنی سے لبریز جواب دیتے ہوئے امریکی صدر جانسن کو کہا تھا۔ ''ہم غیرت مند قوم ہیں کوئی بکاؤ مال نہیں ہیں'' لالچ، دھونس، دھاندلی اور دھمکیوں کے باوجود بھٹو صاحب نے پاکستان کی سالمیت، استحکام، ترقی اور عوام کی خدمت کا پرخار راستہ منتخب کیا۔ ان کے

دورِحکومت کا سب سے بڑا کارنامہ 7 ستمبر 1974ء کو قومی اسمبلی وسینٹ سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا اور 10 اپریل 1973ء کو مقننہ آئین کی منظوری تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو ایٹمی پاکستان کے اولین معمار و بانی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کو دفاعی، سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ مشہور نقاد و دانشور جناب حسن نثار ذوالفقار علی بھٹو کے مختصر دور کے کارناموں کو یوں بیان کرتے ہیں۔ ''چند سالہ دورِ اقتدار میں لاتعداد محاذوں پر لڑنے والا بھٹو، کراچی میں ایٹمی بجلی گھر بنانے والا بھٹو، 90 ہزار جنگی قیدی اور پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ ہندوستان سے چھڑانے والا بھٹو، اسلامی سربراہی کانفرس کا انعقاد اور اوپن یونیورسٹیاں ایجاد کرنے والا بھٹو، چواین لائی اور سوئیکارنو سے لے کر بریذنڈ رسل تک کا فیورٹ بھٹو، آئین سے لے کر شاہراہِ قراقرم تک کا معمار بھٹو۔ پورٹ قاسم کی تعمیر، چشمہ بیراج سے لے کر فرانس اور کینیڈا کے ساتھ دو ایٹمی معاہدے کرنے والا بھٹو، وزارت مذہبی امور بنانے سے لے کر 17 لاکھ ایکڑ زمین ہاریوں میں بانٹنے والا بھٹو، کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے ہزار سال تک لڑنے والا بھٹو اور عالم اسلام کو نیم وفاق کی زنجیر میں باندھنے کی سعی کرنا ذوالفقار علی بھٹو کا سب سے بڑا جرم تھا جو امریکہ کی نظر میں ناقابل معافی جرم تھا۔ امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کرے اور مسلم ممالک کو متحد و منظم کرے چنانچہ امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے بھٹو کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ ''اگر تم نے ایٹمی پروگرام ترک نہ کیا اور اس منصوبے سے باز نہیں آئے تو تمہارا انجام عبرت ناک ہوگا۔'' اس دھمکی کو سن کر جناب ذوالفقار علی بھٹو نے نہایت بہادری سے جرات مندانہ جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''مسٹر ہنری کسنجر یہ پاکستانی قوم کا حق ہے اور پاکستانی قوم اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوسکتی، میں یہ پسند کروں گا کہ

چند جرنیل میری لاش کو سڑکوں پر کھینچتے پھریں لیکن قوم سے غداری کر کے میں تاریخ کا مجرم نہیں بنوں گا'' بھٹو اپنے اس ناکردہ جرم کی پاداش میں امریکی ایماء پر ایک فوجی آمر کے ہاتھوں 4 اپریل 1979ء کو تختۂ دار پر لٹکا دیے گئے۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو سے اپنی آخری ملاقات میں بھٹو نے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جا رہا ہوں تا کہ اس سرزمین کا اس کی خوشبو اور اس کی فضا کا حصہ بن جاؤں۔ خلقِ خدا میرے بارے میں گیت گائے گی۔ میں ان کی کہانیوں کا جاوداں حصہ بن جاؤں گا'' آج قائدِ عوام، فخرِ ایشیاء ذوالفقار علی بھٹو کو ہم سے جدا ہوئے 31 برس گزر چکے ہیں لیکن قوم کے دل و دماغ ان کی یادوں سے آج بھی معطر اور تر و تازہ ہیں۔ وہ تاریخ پاکستان کا ایک ایسا زندہ لازوال کردار ہیں۔ جس کے عزم و حوصلے، جرأت و بہادری بے مثال تدبر اور فہم و فراست سقوط پاکستان کے بعد باقی ماندہ پاکستان کی تشکیل نو کا باعث بنی۔

حضرت بابا بلھے شاہ نے بھٹو کی پیدائش سے کئی سو سال پہلے فرمایا، جو آج بھی سنہری الفاظ میں یاد کیے جاتے ہیں۔

ہند تے سندھ دی ونڈ ہوسی
کج حصہ قصور دا جاسی
پتر سندھڑی دا حکمران ہوسی
بنا عدل او ماریا جاسی

سپریم کورٹ میں بھٹو کا بیان

5 جولائی 1977ء ضیاء الحق مارشل لاء

کامریڈ رؤف لنڈ

پاکستان کی تاریخ کا وہ منحوس ترین دن جس کی طوالت اور تسلسل (بھلے شکلیں بدل کر ہی سہی مگر) آج تک جاری ہے۔ سیاسی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ملکوں میں محض ناپسندیدہ جمہوری حکومتوں کو بدلنے اور اگلی من پسند حکومتوں کے قیام کے لیے ہی مارشل لاء لگائے جاتے ہیں۔ مگر پاکستان کی تاریخ کا یہ پہلا مارشل لاء ہے جو ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری حکومت ہٹانے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے ان کروڑوں محنت کشوں کے خلاف لگایا گیا کہ جنہوں نے 68-1967ء میں انقلابی سرکشی کر کے پاکستان کے سرمایہ داروں، جاگیرداروں، ملاؤں، ججوں اور جرنیلوں کے مسلط شدہ جبری اہتمام اور ان کی عائد کردہ رنگ و نسل۔ مسلک و مذہب، ذات و برادری، اور وطن و قومیت کی خبیث تقسیم کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ عوام کے ذہن سے اس سرکشی کو کھرچنے اور محو کرنے کے لیے کھیلوں کے میدانوں میں بے گناہ لوگوں کو ٹکٹکی پہ باندھ کے ان کے ننگے جسموں پہ کوڑے برسائے گئے، پھانسیاں دی گئیں، شاہی قلعوں کے عقوبت خانوں (جن کا نام سن کر آج بھی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے) میں ڈال کر ان کو برفوں کی سلوں پر لٹایا گیا۔ بجلی کے جھٹکے دیے گئے، پاخانہ پلایا گیا، سیاسی قیدیوں کے سامنے ان کی ماؤں بہنوں کو ننگا لایا گیا اور ان قیدیوں کے ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن نکالے گئے۔ پھر جب ان غیور محنت کشوں کو نہ جھکایا جا سکا تو پاکستان میں مذہبی بنیاد پرستی کے بیج بو کر ایک خدا اور ایک رسول کے ماننے والوں کو ایک

دوسرے کے ہاتھوں ذبح کرایا گیا۔ ہیروئن جیسے قبیح نشے کے ذریعے لاکھوں نوجوانوں کی زندگیاں یوں برباد کی گئیں کہ ان کے ورثاء آئے روز گلیوں میں بہتے گندے پانی سے مردہ یا سسکتی حالت میں اٹھالاتے ،اسلحہ کی سمگلنگ محفوظ اور منافع بخش کاروبار بنا دیا گیا تھا۔ یہ اسی ضیاء الحقی فیض کا شاخسانہ ہے کہ آج بھی پاکستان کے محنت کش گلیوں ، چوکوں ، پارکوں ،سیر گاہوں ،مسجدوں اور بارگاہوں سے اپنے جگر گوشوں کو پھٹے جسموں کے چیتھڑے چن کر شناخت کی تصدیق کے بغیر اپنا سمجھ کر دفنا دینے پر مجبور ہیں۔

ہم محنت کش، مجبور، محروم اور مظلوم جو سرمائے کے گماشتہ اور دلال حکمرانوں اور حکمران طبقے کی خباثت وحرامزدگی کا مسلسل شکار چلے آ رہے ہیں ۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم محض ہاتھ پر ہاتھ دھرے رونے ، داستانیں بیان کرنے اور حالات کا تجزیہ کرنے کے بجائے بالا دست طبقے کی ہر تقسیم کو مسترد کر کے میدانِ عمل میں اتر کر ان ذلتوں اور اذیتوں سے خود کو اور اپنی نسلوں کو نجات دلانے کا عزم کریں اور صبح وشام حتمی فتح سوشلسٹ انقلاب تک اس عہد اور عزم کو یوں گنگناتے رہیں کہ

محبت قرض ہوتی جا رہی ہے
بغاوت فرض ہوتی جا رہی ہے

☆☆☆☆☆☆☆

پروانے جل اٹھے

5 جولائی 1977ء یوم سیاہ

جب چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو کے پروانے جل اٹھے تھے۔ ہے کوئی جو اپنے لیڈر کے لیے خود پر تیل

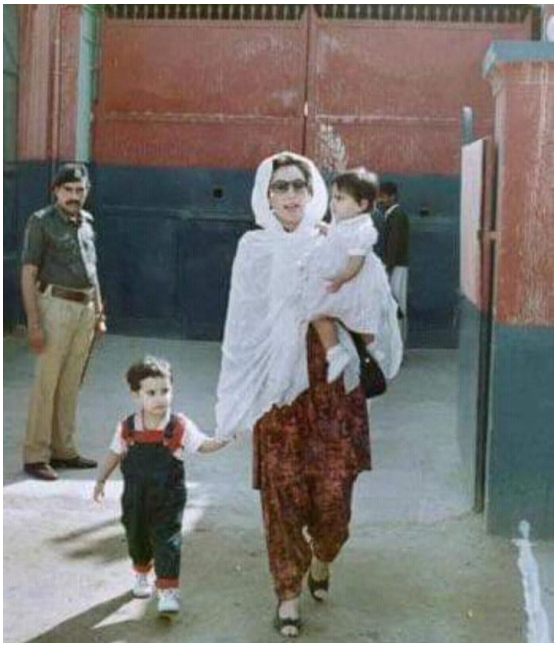

چھڑک کر آگ لگا لے۔تقریباً سات کارکنوں نے اپنی جانیں ذوالفقار علی بھٹو شہید پر قربان کیں چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو نے سپریم کورٹ میں کھڑے ہو کر کہ کوئی کسی کے لیے اپنی انگلی کو نہیں جلا سکتا میرے جان نثاروں نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

جب پروانے جل اٹھے تھے۔ یہ قبریں پنجاب اور ایک تصویر آزاد کشمیر کے ان پروانوں کی ہیں جو اپنے قائد کو پھانسی چڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے اور خود پر تیل چھڑک کر خودسوزی کر کے اپنے قائد چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو شہید پر قربان ہو گئے ۔پہلی قبر گوجرانوالہ کے وحید قریشی کی

دوسری تیسری فیصل آباد کے رشید عاجز اور یعقوب پرویز کھوکھر، چوتھی تصویر آزاد کشمیر کے خودسوزی کرنے والے عزیز ملک کی ہے۔

قبروں پر چادر چڑھانے والے۔۔۔

قبروں پر چادر چڑھانے والوں آغا محمد ندیم، چوہدری جاوید اختر، شیخ شاہد مرحوم نمایاں ہیں۔عزیز ملک شہید کی تصویر کے لیے ان کی نواسی سائرہ خورشید کا شکریہ۔ پاکستان پیپلز پارٹی اگر پنجاب میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا چاہتی ہے تو ان خودسوزیاں کرنے والے پھانسی چڑھنے والے پنجاب کے ان جیالوں کی گمنام قبریں تلاش کرے اور بلاول بھٹو زرداری خود ان قبروں پر چادریں چڑھائیں

۔

یوم سیاہ

اج وی ساکوں یاد اے مرشد

پہرے دار دی گھات

یار ہاں سال دی رات

پیریں اچ زنجیراں پا کے

نچدے گاندے لوگ
بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں
وسدی راہسی جھوک

13 مئی یوم عزم

جس دن صحافیوں کو کوڑے مارے گئے۔ 13 مئی 1978ء کی شام لاہور کے تین نوجوان صحافیوں کو فوجی حکومت کے حکم پر برہنہ کر کے پندرہ کوڑے مارے گئے تو انہوں نے اپنے دانت بھینچ لیے تھے اور درد کی آواز دبالی تھی۔ انہوں نے فوجی دہشت سے خوفزدہ ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ شام آٹھ بجے لاہور کوٹ لکھپت جیل کے میدان میں تین برہنہ آدمیوں کو لا کر ان کے ہاتھ پاؤں ایک ٹکٹکی کے

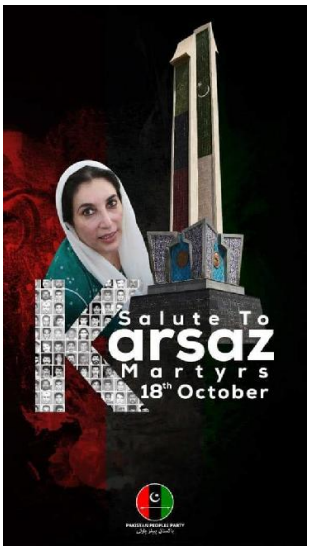

تختے سے باندھ دیے گئے۔ایک پہلوان نما آدمی چمڑے کے کوڑے کو گھما تا دور سے بھاگتا ہوا ان آدمیوں کے قریب آتا اور ان کے اجسام پر پانچ پانچ بار اپنا کوڑا برساتا۔ٹکٹکی کے سامنے کچھ دور تقریباً سو باوردی فوجی اہلکار اور سول سرکاری اہلکار کرسیوں پر بیٹھے دنیا کے اس منفرد واقعہ کا تماشا دیکھ رہے تھے۔جس میں پاکستان کے تین صحافیوں کو پریس کے خلاف فوجی اقدامات پر احتجاج کرنے کے جرم میں کوڑوں کی سزا دی گئی۔جن تین صحافیوں کے جسم پر ضیاء الحق کے کوڑے پڑے ان میں ایک چوبیس سالہ نوجوان اور روزنامہ کے سب ایڈیٹر خاور نعیم ہاشمی تھے۔وہ اپنے اس دور کی یادوں کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔''یہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کا ابتدائی زمانہ تھا جنہوں نے 5 جولائی 1977ء کو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو معزول کر کے اقتدار سنبھالا تھا۔بیس سے زیادہ اخبارات اور رسائل مارشل لاء حکومت کی پالیسیوں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے بند کر دیے گئے تھے اور تمام اخبارات پر سخت سنسر شپ عائد تھی۔ان میں پیپلز پارٹی کا ترجمان اخبار روزنامہ مساوات بھی شامل تھا۔خاور نعیم ہاشمی مساوات اخبار میں کام کرتے تھے۔ان کا کہنا ہے کہ پریس پر دو فوجی تعینات تھے جو اخبار کی کاپی چھپنے سے پہلے اس کا جائزہ لیتے تھے اور ان کے نزدیک جو ناپسندیدہ مواد ہوتا اسے نکال دیتے تا کہ وہ شائع نہ ہو۔خاور نعیم ہاشمی کا کہنا ہے کہ دو بار ایسا ہوا کہ اخبار کی پیشانی پر شائع کی جانے والی قرآن کی آیات بھی اس سینسر پالیسی کے تحت اتار دی گئیں۔ بہت سے صحافیوں نے مارشل لاء حکومت کے پریس پر پابندیوں کے ان اقدامات کے خلاف اور اخبارات کی بندش سے صحافیوں کی بے روزگاری کے خلاف 1978ء میں دو مرحلوں میں احتجاجی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔پہلے مرحلے میں یہ تحریک لاہو میں اور پھر کراچی میں چلنا تھی لاہور میں تین ماہ تک ہر روز چار افراد ایبٹ روڈ پر رضا کارانہ گرفتاریاں دیتے تھے۔جہاں عام لوگوں کا ایک بڑا ہجوم جمع ہو جاتا۔9 مئی 1978ء کو ایبٹ روڈ پر گلستان سینما کے چوک میں چار صحافیوں نے گرفتاریاں دیں جن میں خاور نعیم ہاشمی ،مسعود اللہ خان ،اقبال جعفری اور ناصر زیدی شامل تھے ۔انہیں لاہور کی کیمپ جیل میں لے جایا گیا۔جیل میں سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی فوجی عدالت نے ان کے مقدمہ کی سماعت شروع کی جو روزانہ ہوتی تھی۔

خاور نعیم ہاشمی کا کہنا ہے کہ''چوتھے روز 13 مئی کو فوجی عدالتی افسر نے ان کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں اتروادیں اور اپنی بیٹی اتار دی۔''فوجی افسر نے خاور سے کہا کہ''آؤ بیٹھو بات کریں''

خاور نعیم ہاشمی کے مطابق انہوں نے کہا کہ ''ان کا تو صرف ایک ہی مطالبہ کہ اخبار بند نہ کیے جائیں اور سنسر شپ اٹھالی جائے'' اس پر فوجی افسر اٹھ کر باہر چلا گیا اور کچھ دیر بعد آ کر اس نے چاروں صحافیوں کو پانچ پانچ کوڑے مارنے، تین تین ماہ قید اور جرمانہ کی سزا سنادی۔ خاور نعیم کا کہنا ہے کہ ''سزا پانے والے صحافیوں نے سمجھا کہ یہ سزا صرف انہیں اور دوسرے صحافیوں کو ڈرانے کے لیے دی گئی تھی اور کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ اس پر عمل کیا جائے گا۔ حکومت نے اس سزا کا ہینڈ آؤٹ اسی شام سات بجے جاری کر دیا تھا۔ ان چاروں صحافیوں کو فوری طور پر کیمپ جیل سے کوٹ لکھپت جیل لے جایا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا۔ ان میں سے ایک صحافی مسعود اللہ خان پولیو کے باعث ٹانگوں سے معذور تھے۔ ڈاکٹر نے کہا انہیں کوڑے مارنا ممکن نہیں۔ ڈاکٹروں نے کہا خاور نعیم ہاشمی جسمانی طور پر اتنا کمزور ہے کہ طبی طور پر اس پر کوڑے لگانا موزوں نہیں۔ تین صحافیوں، خاور نعیم ہاشمی، اقبال جعفری، ناصر زیدی سے حکام نے کہا کہ وہ باری باری اپنے تمام کپڑے اتار دیں۔ اس موقع پر انہیں یقین ہو گیا انہیں واقعی کوڑے مارے جائیں گے۔ سب نے عہد کیا کہ وہ کوڑے کھاتے ہوئے درد سے چیخ کی آواز نہیں نکلنے دیں گے۔ رات کو تقریباً آٹھ بجے انہیں باری باری میدان میں لے جایا گیا اور ٹکٹکی پر باندھ کر کوڑے مارے گئے۔ کوڑے مارنے کے

بعد

انہیں تختہ سے اتارا جاتا اور ایک مدہوشی کا ٹیکہ دے کر اسٹریچر پر ڈال کر جیل کے ہسپتال میں لے جاتے۔خاور نعیم ہاشمی کہتے کہ کوڑے کھانے کے بعد انہوں نے قریب آنے والے جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ وہ پیدل چل کر جائیں گے تو اس نے سرگوشی میں کہا کہ اس طرح اس کی ملازمت جاتی رہے گی۔اس نے درخواست کی کہ خاور اسٹریچر پر ہی لیٹ کر جائیں۔تین سال تک خاور نعیم ہاشمی کی پشت پر کوڑوں کے نیل موجود رہے۔جو بعد میں بی بی سی ٹی وی پر بھی دکھائے گئے تھے۔بی بی سی ریڈیو نے رات آٹھ بجے کی خبروں میں صحافیوں کو کوڑے مارے جانے کی خبر نشر کر دی تھی۔جس پر پوری دنیا کے اخبارات میں علامتی ہڑتال کی گئی۔تاہم پاکستان میں صحافی دو حصوں میں تقسیم تھے۔اکثر اخباروں میں ہڑتال نہیں کی گئی۔اگلی صبح ان چار صحافیوں کو بیرکوں میں ڈالا گیا اور وہاں سے ساہیوال جیل منتقل کر دیا گیا۔اسی سال تیرہ اگست کو ان لوگوں کو رہا کیا گیا۔خاور نعیم ہاشمی نے اگلے روز کراچی پہنچ کر ایک بار پھر گرفتاری دی۔انہیں ایک بار پھر فوجی عدالت سے چھ ماہ کی قید کی سزا ہوئی۔جو انہوں نے سینٹرل جیل کراچی اور حیدر آباد جیل میں کاٹی۔کراچی میں اس واقعہ کے چار ماہ کے بعد مارشل لاء حکومت نے صحافیوں کی یونین کے کچھ مطالبے مان لیے اور بند کیے گئے اخباروں کو اشاعت کی اجازت دے دی۔فوجی حکمران ضیاء الحق نے تحریک شروع ہونے پر کہا تھا کہ مساوات بند تھا اور بند رہے گا لیکن اس تحریک کے شروع ہونے کے بعد انہیں یہ اخبار بھی شائع کرنے کی اجازت دینا پڑی۔خاور نعیم ہاشمی کہتے ہیں فوجی حکمران کوڑوں سے صحافیوں کو جھکانا چاہتے تھے۔لیکن صحافیوں کی مزاحمت کے سامنے انہیں خود جھکنا پڑا۔پوری دنیا میں 13 مئی 1978ء کے اس واقعہ کے بعد ہر سال آزادی صحافت کا جو عالمی دن منایا جاتا ہے اس دن کو شروع کرنے کے محرکات میں لاہور کی کوٹ لکھپت جیل کے پندرہ کوڑے بھی شامل تھے جن کے پڑنے پر تین صحافیوں نے اپنی اپنی چیخیں ضبط کر لیں تھیں لیکن ان کی گونج جیل کی دیواروں سے بہت دور پوری دنیا میں پھیل گئی۔

تحریر: عدنان عادل (بی بی سی اردو ڈاٹ کام، لاہور)
تحقیق و ترتیب: زوار حسین کامریڈ

ڈرتے ہیں بندوقوں والے ایک نہتی لڑکی سے

ڈرتے ہیں بندقوں والے ایک نہتی لڑکی سے
پھیلے ہیں ہمت کے اجالے ایک نہتی لڑکی سے
ملا، تاجر جنرل، جیالے ایک نہتی لڑکی سے
آزادی کی بات نہ کر لوگوں سے نہ مل یہ کہتے ہیں
بے حس، ظالم، دل کے کالے ایک نہتی لڑکی سے

حبیب جالب

بھٹو مرتا کیوں نہیں؟

بے نظیر اپنی کتاب میں لکھتی ہیں کہ جب لاہور ہائی کورٹ نے انہیں سزائے موت سنائی تو وہ کوٹ لکھپت جیل گئیں بھٹو صاحب کو لوہے کی تاروں سے بنی چارپائی پر لٹا کر ان کے بازو اور پاؤں کو زنجیروں سے باندھا ہوا تھا۔ چارپائی پر چٹائی بھی نہیں تھی۔ مچھروں کے کاٹنے کی وجہ سے ان کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بے نظیر بھٹو پر نظر پڑتے ہی کڑکدار آواز میں بولے "Hi pinci how are you" اور پھر کہنے لگے آپ کو اندر سے توڑنے کے لیے مجھے اس طرح باندھا گیا ہے لیکن آپ نے ٹوٹنا نہیں ہے۔

پھر جب سپریم کورٹ کے چاروں ججوں نے سزائے موت سنائی (تین ججوں نے انہیں بری کیا کل سات جج تھے) تو انہیں جیل کی کال کوٹھری میں رکھا گیا۔ انہوں نے بھوک ہڑتال کی جو گیارہ روز جاری رہی اس عرصہ میں کال کوٹھری کی چھت پر لوگ بڑے بوٹ پہن کر ناچتے رہتے تھے تاکہ بھٹو سو نہ سکے اس کے باوجود بھٹو بیمار نہیں ہوئے اور بارہویں رات کو پھانسی چڑھ گئے۔

جو دوست اب سوال پوچھتے ہیں کہ بھٹو مرتا کیوں نہیں ہے تو گزارش ہے کہ ایسے بہادر انسان کا جسم تو مر جاتا ہے لیکن نام رہتی دنیا تک زندہ رہتا ہے۔ جیے بھٹو۔

Mourners gather in Rawalpindi on April 4, 1979, for the funeral of Bhutto, who was executed earlier that day

سوگ کا ماحول

چار اپریل کا وہ دن مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ کراچی میں ٹیپو سلطان روڈ پر واقع گھر کے باہر کھڑا تھا جب گلی گلی بٹنے والے خصوصی ضمیمے کی ایک کاپی میرے بھی ہاتھ آ گئی۔ اس لیے بھاگا بھاگا اندر دوڑا اور لا کر والد صاحب کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے ضمیمہ ہاتھ میں لیا۔ سرخی پر نظر پڑتے ہی جیسے سکتے میں آ گئے۔ آنکھیں جھپکنا بند ہو گئیں اور وہ بس اخبار کو تکتے رہے۔ کئی لمحے ایسے ہی گزر گئے میں نے انہیں ذرا ہلا کر پوچھا۔ ''آپ ٹھیک ہیں'' انھوں نے گھور کر میری طرف

دیکھا۔ اس لمحے مجھے ان کی آنکھوں میں بہت غصہ نظر آیا۔ جو جلد ہی گہرے صدمے میں بدل گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر ہمارے گھر میں سوگ کا ماحول تھا اور ملک کے طول و عرض میں گہرا خوف۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا جنرل ضیاء اس حد تک جا سکتے ہیں۔ لیکن شاید ضیاء نے اپنی بقا کے لیے رحم کی تمام اپیلیں مسترد کر کے بھٹو کو تختۂ دار پر لٹکانا ناگزیر سمجھا۔

ضیاء کے مارشل لا کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف پہلے سے کریک ڈاؤن جاری تھا۔ ہر طرف ملٹری حکام کے ہاتھوں سیاسی کارکنوں کی پکڑ دھکڑ جاری تھی۔ خیر پور میں ہمارے گھروں پر فوجیوں نے چادر و چار دیواری کا تقدس پامال کرتے ہوئے چڑھائیاں کیں۔ خاندان کے کچھ مرد

ادھر ادھر چھپ گئے لیکن دادا اور والد صاحب کو فوجیوں نے ہتھکڑیاں لگا کر پہلے تھانے اور پھر جیل میں ڈال دیا۔ ایسے میں جیے بھٹو کا نعرہ فوجی آمریت کی مزاحمت بن گیا۔ ضیا اور اس کے ساتھی جنرلوں کے لیے لوگوں میں پہلے جو غصہ تھا بھٹو صاحب کے عدالتی قتل کے بعد خودی میں بدل گیا۔

آہستہ آہستہ دوست احباب نے ہمارے گھر آنا جانا چھوڑ دیا کہ کہیں ایجنسیوں والے ان کے بھی پیچھے نہ پڑ جائیں۔ ایک بار جب والد صاحب کچھ پرانے جاننے والوں کو ملنے گئے تو انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''آپ یہاں آنے کی زحمت نہ کیا کریں، کیونکہ ہمیں سیاسی لوگوں سے کوئی سروکار نہیں''

بھٹو کی پھانسی کے بعد ضیاء نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کا جو مشن اپنایا اسے طالب علمی کے دنوں میں ہم نے بھی بھگتا۔ سکول میں اعلان ہوا کہ انگریزی، اردو اور سندھی کے ساتھ ساتھ اب عربی بھی لازمی ہوگئی۔ ساتھ ہی ہمارا یونیفارم بھی پینٹ شرٹ سے بدل کر شلوار قمیض کر دیا گیا۔ لڑکپن کے دنوں میں یہ سیاسی زبردستی ایسی ہی تھی جیسے کوئی آپ کو کہے کہ آج سے آپ نائٹ سوٹ میں سکول جائیں گے۔

سکول میں جب بھی والدین کو بلایا جاتا تو والدہ ہی جاتیں۔ دوست پوچھتے ''تمہارے والد کیوں نہیں آتے'' کیا بتاتے کہ وہ جیل میں ہیں؟ ان دنوں میں ہر کوئی دبئی جانے کے چکروں میں نظر آتا تھا سو ہم بھی یہی بتاتے کہ وہ دبئی میں کام کرتے ہیں اس لیے نظر نہیں آتے۔

مارشل لاء کے دوران ہفتے میں ایک بار والد صاحب سے ملاقات کے لیے کراچی سینٹرل جیل جاتے تھے۔ وہاں دیگر سیاسی اسیروں سے بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ فتحیاب علی خان، معراج محمد خان، پروفیسر جمال نقوی اور نفیس صدیقی وغیرہ۔ ایم آر ڈی کی تحریک کا زمانہ آیا۔ جنرل ضیاء نے اسے بھرپور طریقے سے کچلنے کی کوشش کی۔ کئی کو پھانسی چڑھا دیا گیا۔ جو خوش قسمت تھے وہ بچ گئے اور بل آخر رہا کر دیے گئے۔

فوجی سینسر شپ کا وہ زمانہ آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ صبح گھر پر امن یا مساوات اخبار پڑھتے۔ رات کو گھر آٹھ بجے بی بی سی کا پروگرام سیر بین سنتے۔ گھر پر فون نہیں تھا تو کبھی کبھار ایمرجنسی میں پڑوسیوں کے ہاں جا کر فون استعمال کرتے۔ آج کی ڈیجیٹل نسل کو شاید یہ کسی قدیم زمانے کی بات لگے۔ لیکن یہ باتیں اتنی بھی پرانی نہیں۔

آئیڈیلزم کا یہ دور نوے کی دہائی میں دم توڑ گیا۔ جب جمہوریت کے لیے لڑنے والوں نے جمہوریت کو ایک لطیفہ بنا کر رکھ دیا۔ جب جب اقتدار ملا، بدعنوانی اور خراب طرز حکمرانی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ فوجی آمریت کی باقیات اور جمہوریت کے پیروکاروں میں بظاہر میں فرق مٹتا چلا گیا۔ عوامی سیاسی پروگرام کے بجائے پیسہ اور ہتھیار اور ووٹ کرنے والے خود ہی رئیس اور نواب بن بیٹھے۔

یوں ذوالفقار علی بھٹو کی پی پی پی نے کئی اتار چڑھاؤ دیکھے۔ بڑی بڑی غلطیاں کی لیکن بڑی بڑی قربانیاں بھی دیں۔ قربانیوں نے بار بار پارٹی کی ناکامیوں اور غلطیوں کو دھویا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست سے کتنا بھی اختلاف کر لیں ایک بات طے ہے کہ وہ ملک کو ایک متفقہ آئین دے گئے۔ گویا قوم کو سیاسی شعور دے گئے اور اپنے حقوق کے لیے لڑنا سکھا گئے۔ یہ سیاسی عمل چلتا رہے۔ آئینی ادارے ترقی پاتے رہیں اور مضبوط ہوتے رہیں۔ اسی میں اس ملک کی بقا ہے مگر یہ ایک لمبی جدوجہد اور راستہ بہت کٹھن ہے۔

شاہ زیب جیلانی، بی بی سی اپریل 2017

کٹ مرے اپنے قبیلے کی حفاظت کے لیے
مقتل شہر میں ٹھہرے رہے ،ہجرت نہیں کی

فراز احمد فرازؔ

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

27 دسمبر یوم شہادت

محترمہ بے نظیر بھٹو (شہید)

عوام، جمہوریت اور پاکستان کی خاطر اپنی جان قربان کرنے والی قوم کی عظیم رہنما شہید بے نظیر بھٹو اپنی سوچ، عزم اور بصیرت کی صورت میں آج بھی زندہ ہیں۔ پاکستان کی ترقی اور عوام کی خوشحالی کے لیے شہید جمہوریت کا خواب ہمیشہ زندہ رہے گا۔ شہید جمہوریت کے ہر خواب کی تکمیل، ہمارا عزم..... ہمارا مشن۔

صدر پاکستان پیپلز پارٹی وسطی پنجاب قمر زمان کائرہ

مظلوم بہن کی فریاد

''اگر مجھے پتہ ہوتا میری حکومت گرانے کے لیے میرے بھائی کو قتل کیا جائے گا۔ تو میں کبھی بھی پرائم منسٹر ہاؤس کے لیے نہ لڑتی۔''

یہ کوئی سیاسی بیان نہیں ایک مظلوم بہن کی اپنے بھائی کے قتل پہ فریاد ہے۔ کنیزِ کربلا کا یزیدیت کے خلاف مقدمہ ہے۔ مظلومیت کا نوحہ ہے۔ بھٹو خاندان پہ ہونے والے مظالم ہماری تاریخ پہ بدنما داغ ہیں اور اس سے بھی بڑی بے ضمیری یہ ہے کہ قاتل انہیں قتل کرنے کے بعد قتل کا الزام بھی انہی پہ لگاتے رہے۔

وہ دریا دیس سمندر تھی
جو تیرے میرے اندر تھی
وہ سوہنی مٹی سندھڑی کی
وہ لڑکی لال قلندر تھی

یادگارِ کارساز

ہماری خاک سے خوشبو وطن کی آئے گی
ہمارا خون اس مٹی کے رنگ میں شامل ہے

بھٹو کی شہادت کی پرسہ داری

زوار حسین کامریڈ

میری والدہ خورشید بیگم نے ستر کی انتخابی مہم میں قائد عوام کی جیت کے لیے مجھے بارہ سال کی عمر میں ساتھ لے جا کر گلی گلی خواتین میں پی پی پی کی کینوینسنگ جس جوش وجذبہ سے کی تھی اس کے محرکات سیاسی سے زیادہ شیعہ عقیدہ سے وابستگی تھی۔ان کے مطابق چیئر مین پی پی ذوالفقار علی

بھٹو مولا علی کی تلوار ذوالفقار سے منسوب ہے جبکہ انتخابی نشان تلوار بھی تلوارِ حیدر کی علامت ہے۔ ضیاء نے آمریت نافذ کی تو امی نے اسے یزید ثانی قرار دے کر شہید بھٹو کے حق میں احتجاج کرنے کو امام حسینؑ کی عزاداری کے برابر کا رتبہ دے کر مجھے ہر جلسے جلوس میں شرکت کا حکم دیا شہید ذوالفقار علی بھٹو اور پی پی پی پر ٹوٹنے والے مصائب کے ایام امی جان اور مجھ پر گھریلو مشکلات کا بدترین دور لے کر آئے۔ جس کی وجہ والد صاحب کی تین شادیاں اور اس کے نتیجہ میں آنے والی معاشی تنزلی تھی۔ جس سے میری تعلیم بری طرح متاثر ہوئی۔ گھر کا سیٹ اپ کچھ یوں تھا کہ میری امی سمیت تیسری والدہ شیعہ مسلک سے تھیں اور دونوں ایک ہی گھر میں مقیم تھیں۔۔ جہاں محرم کی عزاداری حد درجہ عقیدت اور غم و رنج میں ڈوب کر منائی جاتی تھی جبکہ میری بڑی والدہ محترمہ اہل سنت مسلک کی تھیں اور بچوں کو دینی تعلیم دیتی تھیں۔ ان کے ہمراہ رہنے والے بڑے بھائی اور دو بہنیں بھی سنی عقیدہ کی تھیں۔ فیملی کے حالات 1979ء کے اوائل تک اس نہج پر پہنچ گئے کہ مجھے اپنا گھر چھوڑ کر بڑی والدہ کے گھر منتقل ہونا پڑا اور حصول تعلیم کے بجائے بڑے بھائی کی ورکشاپ پر آٹو مکینک کا کام جبری طور پر سیکھنے کی مشقت کرنا پڑ گئی۔

4 اپریل 1979ء کی صبح آٹھ بجے معمول کے مطابق میں ورکشاپ کھول کر ورکشاپ پر آنے والا ''نوائے وقت'' اخبار جبر کے ساتھ پڑھنے لگا مگر اس میں شائع ہونے والا کوئی بھی لفظ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا بس ایک خوف اور غم کی کیفیت احساسات و جسم پر غالب ہوتی جا رہی تھی۔ اسی اثنا میں مارکیٹ میں شور مچ گیا کہ بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ جیسے ہی شور کی آواز سنی میں اپنے آپ کو جسمانی و شعوری طور پر سکتہ میں محسوس کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بڑے بھائی آئے تو انھیں ارد گرد کے دکاندار مبارکبادیں دینے لگے۔ میں بت بنا خاموشی سے دل چیر جانے والے منظر دیکھتا رہا۔ دل چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ خوشیاں منانے والے سطحی سوچ کے ان بے حس لوگوں کے سامنے رونا کیا چیخنا چنگھاڑنا بھی بے سود تھا۔ تھوڑی دیر بعد مٹھائی بانٹنے کی تو تکار مچ گئی تو میں اپنی پرنم آنکھوں کے ساتھ گاڑی کا کام کرنے کے بہانے ورکشاپ سے دور آ گیا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کی ہمت ہی نہ ہو سکی۔ شام کو ورکشاپ بند کر کے میں فوری طور پر اپنے دوسرے گھر پہنچا تو وہاں محرم سے بھی زیادہ سوگ وار ماحول تھا۔ میری دونوں والدہ محترمائیں الم و غم کی تصویر بنی تمام بچوں کے ساتھ بھوکی پیاسی بھٹو کے بین کرتی اونچی اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔ میں گھر میں داخل ہو کر

دونوں کے گلے لگ کر دل کھول کر رویا تو میرا ماؤف دماغ آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا۔اس دوران آٹھ بجے ہی بی بی سی کی خبریں سیر بین سننے کے لیے جھنگ بازار میں پی پی کے جیالوں کے مرکز تمبا کو کی ایک دوکان پر سیٹ پر خبریں سنتے ہوئے دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

خالد شریف

بہادر لوگ

4 اپریل 1979ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں چیئر مین بھٹو شہید کی غائبانہ نمازِ جنازہ میں شامل ہونے والے یہ لوگ ان بہادر لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے پھانسی کے بعد مارشل لاء کے ڈر، دہشت اور خوف کے باوجود لیاقت باغ کے اردگرد پولیس اور فوج کے حصار کو توڑا اور بندوقوں کے سائے تلے چیئر مین بھٹو شہید کی نمازِ جنازہ ادا کی۔سلام ہے ان بہادروں کے قبیلے سے تعلق

رکھنے والوں کو، ان میں سے جو لوگ زندہ ہیں وہ کسی بھی تمغہ شجاعت کے حقدار ہیں۔ میری حالت ایسی تھی کہ اس مجمع میں شامل ہونے کے باوجود مجھے نہیں پتہ کہ کب صفیں باندھی گئیں اور کب جنازہ ختم ہوا۔ میرا دماغ شل تھا۔ ذہن جیسے کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔ میرے پاس کوئی ٹینک توپ نہیں تھا کہ جنرل ضیاء الحق کے گھر آرمی ہاؤس پر چڑھ دوڑتا خود بھی مر جاتا اور سب کو جلا کر خاک کر دیتا۔ بی بی سی نے رات کو خبر دی تھی کہ کل صبح لیاقت باغ چیئر مین بھٹو کی نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی۔ میں جو پوری رات سو نہ سکا تھا۔ چیئرمین بھٹو شہید کی رہائی کی تحریک میں بھرپور شرکت کے باوجود ہم اپنے لیڈر کو بچا نہ سکے۔ جب راولپنڈی کے کمیٹی چوک میں کارکن اپنے آپ پر پٹرول چھڑک کر آگ لگاتے مجھے افسوس ہوتا کہ کاش یہ اپنے آپ کو آگ لگانے کے بجائے سپریم کورٹ اور اور آرمی چیف کے گھر کو آگ لگائیں۔ لیکن کیا کرتے نہتے کارکن اپنے قائد کو چھڑا نہیں سکتے تھے۔ پھانسی لگتا ہوا دیکھ نہیں سکتے تھے۔ خودسوزیاں کر کے اپنی جان اپنے قائد پر نچھاور کر دیتے یا بھٹو کو رہا کرو جیوے جیوے بھٹو جیوے کے نعرے لگاتے ہوئے گرفتاریاں دیتے۔ جنہیں فوری طور پر سمری ملٹری کورٹ میں پیش کیا جاتا تھا اور فوجی عدالت کوڑوں کی سزا دے کر جیل بھیجتی وہاں ٹکٹی پر باندھ کر کوڑے مارے جاتے۔ کوڑے لگنے سے جو خون بہتا وہی خراج تھا۔ بھٹو کے نام ہر کوڑے کی آواز پر جیے بھٹو کی صدا پوری جیل میں گونجتی۔ میں کبھی کبھی پرانی جیل کے گرد پاگلوں کی طرح طواف کرتا کہ میرا قائد میرا بھٹو یہاں قید ہے کاش میں ان کو چھڑانے کے لیے کچھ کر سکتا کبھی کبھی رات کو اکیلے اپنے بستر اپنی بے بسی دیکھ کر روتا سپریم کورٹ پشاور روڈ راولپنڈی میں چیئرمین بھٹو شہید کی پیشی ہوتی تو گھنٹوں سپریم کورٹ کے آس پاس بیٹھ کر دیکھتا رہتا۔ جس دن احتجاج اور گرفتاریوں کی کال ہوتی نعرے لگانے پولیس پر پتھراؤ اسلامی جمعیت طلبا کے غنڈوں کا بھی مقابلہ کرتے جو اپنی ڈنڈا بردار فوج لے احتجاج کے مقام پر پولیس کے ساتھ پی پی پی کے کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بناتے۔

غائبانہ نمازِ جنازہ والے دن سے پہلے ہی پاکستان پیپلز پارٹی کے ہزاروں کارکنوں لیڈرز کو گرفتار کر لیا تھا کہ جیلوں میں جگہ نہ تھی میں اور پی پی پی کے کارکنوں کی بہت بڑی تعداد پہروں ناکوں کے باوجود لیاقت باغ پہنچی ایسا لگتا تھا کہ پورے پنجاب کی پولیس لیاقت باغ کے اردگرد تعینات ہے۔ نمازِ جنازہ کا وقت آیا تو اردگرد کھڑے ہوئے کارکنوں نے جرأت کا مظاہرہ کیا اور

لیاقت باغ میں داخل ہونا شروع ہو گئے ۔ چند منٹوں میں ہزاروں لوگ لیاقت باغ میں داخل ہو گئے پارٹی کی اعلیٰ قیادت سے لے کر مقامی قیادت جیلوں میں بند تھی ۔ ہجوم جس کی قیادت عوام خود کر رہے تھے پہلے تو ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے اس دن پہلی بار بی بی سی کے نمائندے مارک ٹیلی کو قریب سے دیکھا جو کارکنوں سے اردو میں بات کر رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ کون سے لیڈر جنازے میں شرکت کریں گے ۔ کارکن اتنے رنجیدہ تھے کہ وہ صحافیوں کو جواب دینا بھی مناسب نہیں سمجھ رہے تھے

۔ آنسوؤں اور سسکیوں کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا ۔ کوئی تو چیخ چیخ کر جنرل ضیاء الحق کو گالیاں نکال رہے تھے ۔ میں اپنی دنیا میں مگن یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے ایک دن پہلے پارٹی کارکن ریاض عرف رشو جس سے میری جیل جانے اور واپس آنے کے بعد ملاقات نہ ہو سکی جس کا مجھے دکھ ہے کیونکہ اس نے چیئرمین بھٹو شہید کی رہائی کی تحریک میں میرے ساتھ بھرپور طریقے سے شرکت کی مگر اقتدار آنے کے باوجود مجھے کبھی نظر نہ آیا بھاٹا بھڑا بازار کی کسی گلی میں رہتا تھا ریاض رشو نے مجھے 32 بور کا ایک پستول دیا اور کہا کہ اسے چلانا نہیں صرف اپنی حفاظت کے لیے رکھ لو کل جب لوگ نمازِ جنازہ پڑھیں گے تو ہم اپنا احتجاج ریکارڈ کروائیں گے ۔ نمازِ جنازہ ختم ہوئی تو عوام نے اپنا غم و غصہ احتجاج میں بدلا ابتدا پولیس پر پتھراؤ سے ہوئی ۔ پولیس نے عقل مندی کا ثبوت دیا

اور پیچھے کی طرف ہٹتے رہے اور شدید پتھراؤ کے باوجود ہوائی فائرنگ اور آنسو گیس پر اکتفا کیا ۔کارکن تو خیر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں اور کچھ کارکن گارڈن کالج کی پچھلی طرف سے نکل گئے۔

ہزاروں افراد مری روڈ کی طرف نکل گئے ۔ٹرانسپورٹ بند تھی ۔ہم لوگ پولیس سے آنکھ مچولی کرتے ہوئے عالم خان روڈ کی طرف نکل آئے ۔ میں نے دیکھا کہ سامنے سے پاکستان ٹیلی کام کی بس آ رہی ہے۔ میں اور دیگر لوگوں نے بس کو روکا بس ڈرائیور بھگانے کی کوشش میں تھا۔ میں نے پستول نکالی تو ڈرائیور چپ چاپ بس کھڑی کر کے نیچے اتر آیا اور اس میں بیٹھے لوگ بھی منٹوں میں آگ کے شعلے آسمان تک دکھائی دے رہے تھے۔ پھر جو سرکاری گاڑی نظر آئی جلا دی گئی لیکن ایک بات ضرور تھی کہ کارکنوں نے کسی کی پرائیویٹ پراپرٹی کو آگ نہیں لگائی۔شام تک راولپنڈی میدان جنگ بنا رہا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن اپنے لیڈر کے لیے نہیں نکلے تھے شاید انہیں معلوم نہیں چیئرمین بھٹو شہید کی پھانسی تک خصوصاً پنجاب کی جیلیں پی پی پی کے کارکنوں نے کبھی خالی نہیں چھوڑیں پھانسی کے بعد پاکستان میں ایک سال تک سکوت رہا کیونکہ تمام لیڈر شپ جیلوں میں بند تھی۔کارکن مارشل لاء کے خلاف لڑائی کے لیے تیار تھے۔مگر پارٹی لائن کے انتظار میں بالآخر وہ وقت بھی آن پہنچا جب ایک طرف مادرِ جمہوریت بیگم نصرت بھٹو صاحبہ نے ایم آر ڈی (تحریک بحالی جمہوریت) کے قیام کا اعلان کیا تو دوسری طرف مرتضی بھٹو شہید اور شاہ نواز شہید نے پیپلز لبریشن آرمی کے پلیٹ فارم سے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف مسلح جدوجہد کا اعلان کیا جس کا نام بعد میں الذوالفقار رکھا گیا۔

اورنگ زیب ظفر

سینئر وایس پریذیڈنٹ پاکستان پیپلز پارٹی کینیڈا

پھانسی والے جیالے

سرفروشی کے انداز بدلے گئے تو دعوت قتل پر مقتل شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا

مارشل لاء کے دور میں پھانسی پانے والے پاکستان پیپلز پارٹی کے جیالے۔ مرزا ادریس بیگ شہید، ادریس طوطی شہید، عثمان غنی شہید، عبدلرزاق جھرنا شہید، ایاز سموں شہید، ناصر بلوچ شہید

جے کر یار دے ناں دا ملے طعنہ
جھولی پا لیئے تھلے سیٹے ناں
جے کر یار دے ناں دی دی ملے سولی
جھوٹا لے لیے پچھاں ہٹے ناں

جالب میں اور کوٹ لکھپت جیل

ڈاکٹر اسرار شاہ

لاہور میں دوست جالب میلے کا انعقاد کر رہے ہیں اور میں کاغذ اور قلم پکڑے اپنے ماضی میں کھو گیا دوستوں نے اصرار کیا کہ اسرار شاہ لکھو۔

میری دعا ہے کہ کوئی نیا ضیاء الحق پیدا نہ ہو اور مجھے عمرِ رفتہ میں لے جائے میں کالج سے نکلوں تو ایسی یونیورسٹی میں داخل ہو جاؤں جہاں ڈاکٹر مبشر حسین، میاں محمود علی قصوری راؤ رشید، رضا کاظم

ایڈووکیٹ چوہدری اعتزاز حسین ،جسٹس سعید حسن ،آئی اے رحمن ، پروفیسر امین مغل، چوہدری اصغر خادم، رشید قریشی ،شعیب ہاشمی ،حمید اختر ،محمد علی ایکٹر اور حبیب جالبؔ جیسے پروفیسر اور اساتذہ نظر بند ہوں نئی نسل ناواقف ہے کہ یہ تمام لوگ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے اور ان میں کچھ آج بھی حیات ہیں۔

کوٹ لکھپت جیل بھی کیا جیل تھی ،جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے جیل کی دیوار کے ساتھ شام کو واک کرنے کی اجازت دی ڈاکٹر مبشر صاحب جیل میں ''ماں'' کا کردار ادا کر رہے تھے وہ جیل سے راشن لیتے اس کو پکواتے تمام لوگ چٹانوں پر بیٹھتے اور سب میں برابر تقسیم کرتے۔صبح دس بجے سے لے کر دوپہر کے کھانے تک عبداللہ ملک صاحب کے کمرے میں سٹڈی سرکل ہوتا اور آئی اے رحمن صاحب لیکچر دیتے اور تمام سرنگوں ہوتے۔

حاجی رشید انور جن کا تعلق مزدور کسان پارٹی سے تھا کیا خوبصورت انسان تھے عمر کے اعتبار سے وہ میرے والد کی طرح تھے جسم میں سی آئی اے چونا منڈی کے تشدد کی دردیں موجود تھیں وہ صبح میرے جسم کو دباتے اور بچوں کی طرح پکارتے ہوئے اٹھاتے کہ ''اسرار شاہ'' اٹھ جاؤ سورج نکل آیا ہے۔

ہماری بارکوں اور ڈیوڑھی کے درمیان ہسپتال کے سامنے ایک پارک تھا روزانہ دل دہلا دینے والے منظر دیکھتے کہ ایک طاقتور ٹائپ قیدی سرخ لنگوٹ پہنے جسم پر تیل لگائے کرکٹ کے فاسٹ باؤلر کی طرح فضا میں کوڑا لہراتے ہوئے آتا اور پارک میں درخت کے ساتھ بندھی ہوئی انسانی ڈمی کی پشت پر مارتا علی الصبح کسی بھی صاحب دل کے لیے یہ منظر کافی تھا۔

محمد علی ایکٹر کیا نفیس انسان تھے ہمیشہ بیٹا کہہ کر پکارتے اور تا مرگ اس رشتے کی لاج رکھی 19 اپریل 1981ء محمد علی کی سالگرہ تھی جیل کے تمام دوستوں نے ان کی سالگرہ منانے کا اہتمام کیا۔سپرنٹنڈنٹ کی منت کر کے کیک کا انتظام کیا گیا اور جالب صاحب نے قیدی کے نام سے ایک نظم سنائی جس میں تمام سیاسی قیدیوں کے نام تھے جو انکی کتاب ''گنبدِ بے در'' میں موجود ہے۔

جالب صاحب اور میرے رومیٹ حاجی رشید انور اور قیصر مصطفی کے ناموں کا شعر لکھنا بھول گئے اور اس وقت ہماری بی کلاس نہیں تھی جہاں ہم قید تھے ہر صبح قیدی دو قطاروں میں مشقت کے لیے جیل کی دیوار سے متصل فیکٹری میں کام کرنے جاتے کھدر کا سفید لباس سر پر ٹوپی اور خطر

ناک قیدیوں کے پاؤں کی بیڑیوں کی جھنکار کو سننا روز کا معمول تھا۔

کال کوٹھڑی کے دروازے علی الصبح کھل جاتے اور شام بجے بند ہو جاتے سالگرہ کی تقریب ختم ہوئی تو میں نے حاجی صاحب سے کہا کہ مجھے کاغذ اور پنسل دیجیے میں نظم لکھنا چاہتا ہوں اور اس کے ردعمل میں مجھ پر کچھ اشعار وارد ہوئے۔ صبح ناشتے کے وقت سب چٹائی پر براجمان تھے حاجی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اسرار شام نے نظم لکھی ہے جس پر انہوں نے مخصوص لہجے میں کہا ''ارشاد'' جس کے ابتدائی شعر کچھ یوں ہیں:

یہ کیسے تو نے قیدی دیکھے
دیکھ صبح مجبور وہ قیدی
بانہیں جن کی سوکھی ہیں
چلنے سے معذور وہ قیدی
اے، بھی دیکھے، بی، بھی دیکھے
کیوں نہ دیکھے سی، کے قیدی
حیرت سے وہ دیکھ رہے ہیں
یہ ہیں وہ جمہور کے قیدی

جالب صاحب اس وقت سوئے ہوئے تھے۔ شام جب میں اور جالب صاحب واک کر رہے تھے تو انہوں نے بڑے مخصوص انداز میں کہا ''تو نے میرے مقابلے میں لکھی ہے'' تو میں نے ادب میں ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور کہا کہ ''میں آپ سے مقابلے کی گستاخی نہیں کر سکتا'' پھر انہوں نے ارشاد فرمایا ''میں نے تمہیں شیرِ نر بنا دیا ہے اور انہوں نے سنایا ''بندھے بیٹھے ہیں سلاخوں میں شیرِ نر قیدی''

جالب صاحب سنت نگر میں کرائے

کے مکان میں رہتے تھے ایک دفعہ مشاعرے کی دعوت لے کر ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بستر بھی نہیں تھا لیکن غیرت مند اتنا کہ حکمرانوں سے ٹکرانا ان کا مشغلہ تھا۔

پندرہ دن کے بعد صرف ایک دفعہ والدین سے ملنے کی اجازت تھی میں ڈیوڑھی میں اپنے والدین سے ملاقات کرنے جا رہا تھا اور جالب صاحب ملاقات کر کے واپس آ رہے تھے تو راستے میں ان سے کراس ہو گیا تو میں نے جالب صاحب سے کہا۔

''ملاقات آئی ہے''

انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، ڈاکٹر:

حالات کا ماتم تھا ملاقات کہاں تھی
جو بات وہ کہہ نہ سکی چہرہ سے عیاں تھی

جالبؔ میں اور جیل جیسے

(دوسری قسط)

انسان ماں کی گود سے گور تک سیکھنے کے عمل سے گزرتا ہے۔ ویسے بھی یونیورسٹی کا طالبعلم تھا اور زندگی مطالعے کے بجائے مشاہدے میں گزر گئی۔ ضیاء الحق کے دور میں عدالتوں کے اختیارات معطل تھے اور تمام سیاسی قیدی فوجی حکمرانوں کے حکم کے پابند تھے۔

جنرل جیلانی پنجاب کا گورنر تھا اور اسمبلی حال مارشل لاء ہیڈ کوارٹر تھا جو اس وقت کے چیف آف سٹاف ٹو گورنر پنجاب کے کنٹرول میں تھا وہاں سے نظر بندیوں کے حکم جاری ہوتے تھے۔ جس کی مدت تین ماہ ہوتی اور اس کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی اگلے تین ماہ کا حکم نامہ جاری کر دیا جاتا۔ محمد علی ایکٹر کو ڈسٹرکٹ جیل جھنگ منتقل کر دیا گیا اور سب پر ایسے گزری کہ جیسے خاندان کوئی فرد بچھڑ رہا ہو۔

جیل میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کی برسی منائی گئی اور یکم مئی پر بھی ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا

طوالت کے خوف سے تفصیل نہیں لکھ رہا تین ماہ پورے ہوئے تو اگلے تین ماہ کی نظر بندی کا پروانہ آ گیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد جیل کے حکام کی طرف سے پیغام ملا کہ پیچھے سے حکم ہے کہ جو شخص معافی نامہ اور نیک چلنی کی ضمانت دے گا وہ جیل سے رہا ہو سکتا ہے۔

جیل کے لان میں تمام نظر بند قیدیوں کی میٹنگ ہوئی ملک محمد حسین ایڈوکیٹ اور دوسرے جیل کے ساتھیوں نے احتجاج کیا کہ ان کی شرائط پر کوئی رہائی حاصل نہیں کرے گا۔ جسٹس سعید حسین اپنے مزاج کے انسان تھے انہوں نے اختلاف کیا اور پنجابی میں کہا

''ضیاء الحق منافق اے ماں نے چھ فٹ دو انچ دا سوہنڑا منڈا جیلاں وچ سڑن واسطے پیدا نئیں کیتا تسی جیل جھپہ پا کے رکھو میں جا رہیا واں''

کچھ دوستوں نے میری رہائی کا مطالبہ میٹنگ میں رکھا اور کہا کہ اسرار شاہ طالب علم ہے اس کی تعلیم کا حرج ہو رہا ہے اس کے لیے کیا حکم ہے؟ تو پھر راؤ رشید صاحب اور تمام دوستوں نے کہا کہ اس کو ہر صورت باہر جانا چاہیے۔ والد محترم نے مارشل لاء ہیڈ کوارٹر میں میری رہائی کے لیے درخواست دی تو معلوم ہوا کہ میرا کیس مختلف ہے اور میں الذوالفقار کے حوالے سے زیر تفتیش ہوں۔

یکم مئی سے پہلے ایک شخص کو میرے سیل میں نظر بند کیا گیا جس نے اپنا تعارف راجہ اورنگزیب کے نام سے کروایا اور خود کو واہ فیکٹری کا لیڈر ظاہر کیا وہ مجھ سے ہر وقت الذوالفقار کی باتیں کیا کرتا اور کہتا میرا تعلق میر مرتضیٰ بھٹو سے ہے اور میں باہر جا کر تمہارا رابطہ افغانستان میر مرتضیٰ بھٹو سے کروں گا۔ میں نے کہا میرا میر مرتضیٰ سے کیا تعلق کہا اس کاغذ پر لکھ دو اور وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا شاید اس کو میری intention نوٹ کرنے کے لیے سیل میں ڈالا گیا ہو

لیکن اس کے بعد میں نے آج تک اس شخص کو نہیں دیکھا اس واقعہ کے بعد مجھے جیل کی ڈیوڑھی سے پیغام ملا کہ تمہاری ملاقات آئی ہے میں ڈیوڑھی میں پہنچا تو مجھے گھر کا کوئی فرد نظر نہیں آیا تو اشارہ کیا ڈپٹی سپر ٹنڈنٹ جیل کے

کمرے میں چلے جاؤ کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا ہلکے پیازی رنگ کے سفاری سوٹ میں ملبوس ہاتھ میں کالے رنگ کی چھڑی لیے ڈپٹی سپر ٹنڈنٹ کی کرسی پر ایک شخص جھول رہا تھا اس کے علاوہ چار لوگ سائڈ کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جیل حکام کے کسی فرد کو کمرے میں آنے کی اجازت نہ تھی کرسی پر گھومتے ہوئے بڑے فلمی انداز میں مجھے بیٹھنے کا حکم دیا اپنا تعارف میجر مسعود کے نام سے کروایا بعد میں علم ہوا کہ وہ شاہی قلعے میں مقیم قیدیوں کا انچارج تھا۔ اس نے کہا کہ جو سوال کروں اس کا مجھے صحیح جواب چاہیے پیپلز پارٹی میں کس سے متاثر ہو؟

''میں نے کہا ذوالفقار علی بھٹو سے''

اس نے کہا وہ تو مر گیا اس کے بعد کس سے متاثر ہو؟ میں نے کہا:

''میرا تعلق پی۔ایس۔ایف سے ہے پارٹی کے لوگوں میں میرا زیادہ رابطہ نہیں۔''

سوال کیا کہ کبھی شیخ رشید (بابائے سوشلزم) سے ملے ہو؟

میں نے کہا ''ان سے کبھی نہیں ملا پھر بھی پی۔ایس۔ایف کے حوالے سے جہانگیر بدر سے کبھی

کبھی

ملاقات ہوتی تھی۔''

جہانگیر بدر کا نام سن کر اس کے چہرے پر بڑی ذومعنی مسکراہٹ تھی اس نے کہا:

''میں نے اس سے تفتیش کی ہے اس نے جو ریمارکس دیے میں اس کو دہرانا نہیں چاہتا اس نے کہا کہ تم اس کو لیڈر سمجھتے ہو میں نے کہا کہ ہاں اور مجھے جانے کا حکم دیا۔

تفتیش کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اب میری رہائی ہو جائے گی کیونکہ وہ سمجھ گیا کہ جو جہانگیر بدر کو لیڈر کہتا ہے اس کا اپنا ذہنی معیار کیا ہو گا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اور جہانگیر بدر ہمیشہ پارٹی میں ایک دوسرے کے حریف رہے اور ساری جنگ میں میرا ایک نظریاتی دوست خالد بٹ سائے کی طرح میرے والدین کے ساتھ رہا اس کے بعد جب میری رہائی کا حکم آیا تو میرا آخری سمیسٹر ختم ہو چکا تھا اور میرا ایک تعلیمی سال ضائع ہو گیا تھا۔

ایف آئی آر

تھانہ پرانی انارکلی اور FIR نمبر 211/81 ایک ایسی ایف آئی آر جس کے ہزاروں سیاسی کارکنوں کو گرفتار کیا گیا۔ تھانہ پرانی انارکلی لاہور بی بی سی اردو آج بی بی سی کے پروگرام سیر بین میں عالیہ ناز نے جو رپورٹ پیش کی دلچسپ ہے۔ جس میں تھانہ کے ایس ایچ او بھگت سنگھ کیس کے متعلق بتایا مگر جو سب سے اہم مقدمہ اس پولیس اسٹیشن کا تھا جس کا ایف آر آئی نمبر 211/81 ہے بھول گئے اس کے متعلق ان کو معلوم نہیں تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مارشل لاء حکام نے وہ ریکارڈ ضائع کر دیا ہو کیونکہ یہ مقدمہ کیمرہ ٹرائل تھا۔ جو کہ اسپیشل ملٹری کورٹ میں چلا بی بی سی کا ریکارڈ چیک کیا جائے تو 7 اگست 1948ء کو یہ مقدمہ شروع کیا تھا۔ اس کی تمام خبریں مل جائیں گی۔ مقدمہ کے آغاز سے لے کر پاکستان کی سب سے بڑی بھوک ہڑتال اور فیصلہ تک بی بی سی نے مکمل خبریں دیں۔ اس دن صبح سویرے کوٹ لکھپت جیل میں پہلے عثمان غنی شہید اور ادریس بیگ شہید کو پھانسی دی گئی اور پھر چند گھنٹوں بعد ہم 54 سیاسی قیدیوں کو فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس مقدمے میں چون افراد فوجی عدالت میں موجود تھے۔ چھیاسی افراد جن میں میر مرتضی بھٹو شہید، شاہ نواز بھٹو شہید، مرزا اختر بیگ، یعقوب چینا، سہیل سیٹھی، آغا ندیم، عمر حیات اور بہت سے سیاسی کارکن تھے۔ تھانہ پرانی انارکلی کی ایف آئی آر 211/81 میں ہی پاکستان پیپلز پارٹی کے سینکڑوں نہیں ہزاروں کارکنوں کو

گرفتار کر کے لاہور کے شاہی قلعہ اور لال قلعہ (لال قلعہ بھی لاہور ہی میں ہے) لایا گیا۔ یہ ایف آئی آر تو تھانہ کلی درج گئی مگر ملزمان تفتیش پولیس اسٹیشن بجائے مختلف انار میں کی تمام کی اس کے

Bhutto's government established Allama Iqbal Medical College Lahore (then Lahore Medical College) on May 2 1975.

Bhutto's government established Hayat Shaheed Teaching Hospital Peshawar in 1976 (now is called khyber teaching hospital).

Bhutto's government made Islamic and Pakistan studies compulsory in schools.

Book banks were created in most institutions and over 400,000 copies of text-books were supplied to students.

Bhutto established Gomal University Dera Ismail Khan in 1973 and world class Quaid-e-Azam University and Allama Iqbal Open University in Islamabad in 1974.

Bhutto established the Allama Iqbal Medical College in 1975.

In 1974, with the help of Dr Abdus Salam, Bhutto gave authorisation of the International Nathiagali Summer College on Contemporary Physics (INSC) at the Nathiagali and as even as of today, INSC conference is still held on Pakistan, where thousands of scientists from all over the world are delegated to Pakistan to interact with Pakistan's academic scientists.

In 1976, Bhutto established the Engineering Council, Institute of Theoretical Physics, Pakistan Academy of Letters and Cadet college Razmak in North Waziristan.

further four new Universities established at Multan, Bahawalpur, and Khairpur.

People's Open University is another innovative venture which has started functioning from Islamabad.

For Hostels, Directions were issued that fans, water-coolers and pay-telephones must be

provided in each and every hostel in as short a time as physically possible.

Seven thousand new hostel seats were planned to be added to the existing accommodation after the 1977 election.

The agricultural land ceiling, for the first time, was fixed, in Bhutto's period, to 150 acres of irrigated land and 300 acres of non-irrigated land.

Huge tax exceptions were also introduced for small landowners.

Bhutto upgraded a number of dams and barrages.

Bhutto Government initiated schemes for combating water logging and salinity.

In 1976, the Bhutto government established Federal Flood Commission (FFC), and was tasked to prepare national flood protection plans, and flood forecasting and research to harness floodwater.

Bhutto government launched programs to put the country on to self-sufficiency in rice, sugar, wheat and industries.

Bhutto's nationalisation of industries heavily benefited the poor mass, but badly upset the influential feudal lords.

In Balochistan, Sardari System was abolished.

KESC was created and kept under complete government control with no private influence.

Bhutto also established ..
Atomic Energy Commission .
the Port Qasim,
Pakistan Steel Mills,
the Heavy Mechanical Complex (HMC)
and several cement factories.

BHUTTO Government given the Constitution in 1973.and in his time National Identity cards started for the nation.
He arranged millions of job for skilled workers in Gulf countries..
Throughout Bhutto's period the growth rate of economy relative to that of the 1960s remained at equilibrium level despite the global oil crises in 1973 and without USAid and with USA sanctions.

Bhutto's policy largely benefited the poor and working class when the level of absolute poverty was sharply reduced.

The land reform programme provided increased economic support to landless tenants.

Development spending was increased especially in health, education, roads, rails and airports constructions.

Foreign companies and industries in Pakistan were exempt from nationalisation to keep the flow of investment intact.

In 1973, Bhutto said that: "activity of public sector or state sector prevents the concentration of economic power in few hands, and protects the small and medium entrepreneurs from the clutches of giant enterprises and vested interests" in front of investers of Lahore Chamber of Commerce.

In July 1973 Bhutto founded the National Development Finance Corporation(NDFC) with an initial government investment of 100 million rupees. The NDFC is currently the largest development finance institution of Pakistan. 42 projects financed by NDFC have contributed Rs. 10,761 million to Pakistan's GDP and generated Rs. 690 million after-tax profits and 40,465 jobs.

مقامات پر ہوئی۔ 211/81 تھانہ پرانی انارکلی سے باہر کی یہ FIR پینسٹھ صفحات پر مشتمل تھی جسے

The Bhutto government increased the level of investment, private and public, in the economy from less than Rs. 7,000 million in 1971–72 to more than Rs. 17,000 million in 1974–75.

Bhutto amended banking laws forcing banks to ensure 70% of institutional lending should be for small land holders of 12.5 acres or less. It was a revolutionary idea at a time when banks only clients were the privileged classes.

The number of bank branches rose by 75
#Team

فوجی عدالت سے باہر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔مگر میں جیسے تیسے یہ FIR جیل سے باہر ایک سپاہی کو 100 روپے دے کر بھجوادی جو میرے پاس آج بھی محفوظ ہے۔اس کا پہلا اور آخری صفحہ میں احمد نواز امروہی صاحب پنجاب کے نوجوانوں نے جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے خلاف جاں گسل لڑائی لڑی تھی۔جب کراچی کے علاوہ دوسرے صوبے ستوپی کر سو رہے تھے۔خودسوزیاں ، پھانسیاں ،ننگی پیٹھوں پر کوڑے لمبی لمبی سزائیں۔مگر ان نام نہاد پنجابی قوم پرستوں اور بائیں بازو والوں کو 90 سال پہلے پھانسی لگنے والا بھگت سنگھ یاد ہے مگر عبدالرزاق جھرنا شہید، ادریس طوطی ،عثمان غنی شہید، ادریس بیگ شہید نہیں وجہ بغض بھٹو۔

Ahmed Nawaz Amrohi

پنجاب میں لوگ رنجیت سنگھ اور بھگت سنگھ کو تو یاد رکھتے ہیں لیکن شہید رزاق جھرنا جو پنجاب کا سچا پتر کیوں بھول جاتے ہیں۔جس نے بھٹوازم کے لیے رقص کرتے ہوئے، دلیری کے ساتھ جام

شہادت نوش کیا۔اس کی جگہ نہ بھگت سنگھ اور نہ رنجیت سنگھ لے سکتا ہے۔

رزاق جھرنا کو سرخ سلام

بھٹو شہید پارک

جناح پارک راولپنڈی کا نام بھٹو شہید پارک رکھا جائے۔بھٹو شہید پارک جی ہاں جس کا نام اس بدبخت نے جناح پارک میں تبدیل کر دیا تھا۔اڈیالہ جیل بنانے کا مقصد ہی یہی تھا کہ انہیں

اندازہ تھا کہ اگر پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت آتی ہے تو وہ لازمی اس جگہ پر یادگار بنائیں گے۔ جہاں چیئرمین بھٹو شہید کو پھانسی دی گئی۔ پنجاب حکومت نے سب سے پہلے تو یہاں پرانی جیل گرا کر ہاؤسنگ سکیم کا اعلان کیا یہ راولپنڈی کا مہنگا ترین علاقہ تھا۔ پلاٹ بنا کر نیلام کیے گئے۔ پھانسی گھاٹ والی جگہ بھی پاکستان پیپلز پارٹی کی رہنما آمنہ پراچہ نے سب سے زیادہ قیمت دے کر خرید لی تھی۔ پی پی پی کی حکومت آئی تو وہاں ہاؤسنگ سکیم ختم کر کے بھٹو شہید پارک بنا دیا گیا۔ وہاں ایک کوٹھڑی بھی تعمیر کی گئی تھی مجھے نہیں معلوم وہ موجود ہے یا ختم کر دی گئی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد نواز شریف پارک تو نہ ختم کر سکا مگر نام تبدیل کر گیا۔ میں نے اس وقت اخباری بیانات کے ذریعے باقاعدہ مہم چلائی تھی۔ پھر میں ہانگ کانگ کینیڈا چلا آیا۔ آج جب یہ وڈیو دیکھی تو زخم تازہ ہو گئے کہ نواز شریف نے بھٹو شہید پارک کا نام تبدیل کیا تھا۔ ویسے یہ تقریر سنو تو کتنی رعونت تھی اس کے لہجے

میں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو شہید اور آصف علی زرداری کے دل کتنے بڑے تھے کہ اس کے باوجود اس سے میثاق جمہوریت کیا بات اور طرف نکل جائے گی۔ کارکنان سے گزارش ہے کہ وہ بھٹو شہید پارک نام واپس کرنے کی فی الحال کم از کم سوشل میڈیا پر مہم چلائیں۔ کیونکہ یہ پھانسی گھاٹ ہمارا

اثاثہ ہے یہاں چیئرمین بھٹو شہید کے علاوہ راولپنڈی کے جیالے ادریس بیگ شہید کو پھانسی دی گئی تھی۔

بھٹو کیوں زندہ ہے؟

یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن

لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

گمنام ہیرو

آئیں اپنے گمنام ہیروز کی قبریں تلاش کریں۔اسی کی دہائی میں جب سندھ میں قوم پرستی کی

تحریک نے زور پکڑا تو انہیں اپنے ایک گمنام ہیرو شہید جنرل ہوش محمد شیدی کی قبر تلاش کرنے کا خیال آیا ہوشو شیدی کے نام سے مشہور اس ہیرو نے انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے سب سے پہلے (مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں) کا نعرہ لگایا تھا۔ جب چیئرمین بلاول بھٹو زرداری نے مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں کا نعرہ لگایا تو انہوں نے بھی شہید ہوش محمد شہید کے مزار پر حاضری دی اور سندھ حکومت کو مزار کی تعمیر کا حکم دیا۔ کمنٹس میں اس ہوش محمد شیدی کے مزار کی تصویر موجود ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی جاں گسل مزاحمتی تحریک میں کارکنوں نے بیش بہا قربانیاں دیں۔ ان میں سب سے پہلے ان ہیروز کا نام آتا ہے۔ جنہوں نے چیئرمین بھٹو شہید کی رہائی کی تحریک میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہوئے خودسوزیاں کیں اپنی جانیں چیئرمین بھٹو شہید پر وار دیں ان میں ایک نام کشمیر سے تعلق رکھنے والے ملک عزیز شہید کا ہے جو پیشے کے اعتبار سے صحافی (پریس فوٹو گرافر) تھے۔ جنہوں نے راولپنڈی کے کمیٹی چوک پر چیئرمین بھٹو شہید کی

رہائی کے لیے اکٹھے ہونے والے ہزاروں کے مجمع میں اپنے آپ پر تیل چھڑک کر آگ لگالی تھی اور قربان ہو گئے کیونکہ وہ اپنی زندگی میں اپنے محبوب چیئرمین بھٹو کو پھانسی چڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں کچھ عرصہ پہلے خودسوزیاں کرنے والے پروانوں کے لیے پوسٹ کی تو ان کی نواسی سائرہ

خورشید ایڈوکیٹ نے مجھ سے رابطہ کرتے ہوئے بتایا کہ ملک عزیز شہید ان کے نانا تھے۔خوشی ہوئی کہ عزیز ملک کی تیسری نسل پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ ہے۔سائرہ خورشید نے ملک عزیز کے مزار کی تعمیر اور وہاں تک پکی سڑک کی منظوری دی تھی۔ان کی پولیٹیکل سیکرٹری محترمہ ناہید خان کا ایک لیٹر بھی انہیں موصول ہوا مگر شاید محترمہ بے نظیر بھٹو کی 18 ماہ کی حکومت میں یہ ممکن نہ ہوسکا۔ میری پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت خصوصاً پاکستان پیپلز پارٹی سے گزارش ہے کہ وہ آزاد کشمیر کے اس بیٹے کی قربانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے مزار کی تعمیر کروائیں اور باقاعدہ ہر سال ان کی برسی منائی جائے۔ہماری بیٹی سائرہ خورشید ایڈووکیٹ جو کہ پاکستان پیپلز پارٹی سندھ نوتی شعبہ خواتین کی صدر ہیں آنے والے الیکشن میں خواتین کی مخصوص سیٹ پر ممبر منتخب کروایا جائے تاکہ ملک عزیز شہید کے سامنے سرخرو ہوسکیں کہ ہم نے ان کی قربانی کی لاج رکھی۔اپنے بہت ہی محترم سیاسی استاد سردار سلیم صاحب سے گزارش ہے کہ چونکہ وہ خود اس زمانے میں چیئرمین بھٹو کی رہائی کی تحریک میں شامل تھے اور ملک عزیز شہید کو جانتے ہیں اس سلسلے میں ہماری معاونت فرمائیں۔(جیے بھٹو)

☆☆☆☆☆☆

شہدائے خیر پور ناتھن شاہ

ستون دار پر رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تک یہ ظلم کی سیاہ رات چلے

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف تحریک بحالی جمہوریت 1983ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے پانچ سو ارکان شہید ہوئے تھے مگر 12 ستمبر 1989ء کو سب سے خون ریز واقعہ خیر پور ناتھن شاہ سندھ میں پیش آیا جب فوج کی گلیوں سے بارہ افراد شہید ہوئے۔آج ان کی برسی خیر پور ناتھن شاہ میں منائی جارہی ہے۔

تاریخ کا سب سے بڑا جلسہ

10 اپریل 1986ء لاہور پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا جلسہ اور استقبال جس میں 10 لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔ لاہور ائیر پورٹ سے مینار تک چند منٹوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہوا۔ ٹنوں کے حساب سے پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں کہ لاہور کی سڑکیں سرخ ہو گئیں لاہور کے ہوٹلوں ریڑھی بانوں کے پاس کھانے پینے کی اشیاء ختم ہو گئی تھیں۔ عوام نے ایسا جلسہ پھر کبھی نہ دیکھا تھا اور یہ وڈیو آپ پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ (بشکریہ: اسلم خواجہ)

شہدائے سکرنڈ

چیئرمین بلاول بھٹو زرداری کا ایم آر ڈی کے دوران سکرنڈ میں شہید ہونے والے 16 کارکنان کی برسی پر پیغام۔

پی پی چیئرمین نے سانحہ سکرنڈ کی 38ویں برسی پر شہدا کو خراج عقیدت پیش کیا۔ایم آر ڈی کے دوران پی پی کی قیادت اور کارکنان کی جدوجہد اور قربانیاں ہماری تاریخ کا ناقابل فراموش باب ہے)بلاول بھٹوزرداری (۔تحریک آزادی پاکستان کے بعد ایم آر ڈی اس ملک کی سب سے بڑی مشکل جدوجہد تھی جس کی قیادت شہید محترمہ بےنظیر بھٹو نے کی (بلاول بھٹوزرداری)۔جنرل ضیاءالحق کے دورِآمریت میں آج کے دن 16 جیالوں کو تحصیل سکرنڈ کے گاؤں پنھل چانڈیو میں شہید کیا گیا تھا (بلاول بھٹوزرداری)۔شہید ٹھارو چانڈیو،شہید رجب علی چانڈیو اور شہید پیر بخش چانڈیو کو سلام (بلاول بھٹوزرداری)۔شہید عرس چانڈیو،شہید صدیق چانڈیو شہید گلاب چانڈیو شہید ہاشم خاصخیلی ،شہید جانب خاصخیلی اور شہید میرو خاصخیلی کو سلام (بلاول بھٹوزرداری)۔شہید علی گل خاصخیلی ،شہید محمد رمضان خاصخیلی ،شہید محبوب علی سولنگی ،شہید اللہ رکھیو سولنگی اور شہید حسین بخش منگھار کو بھی سلام (بلاول بھٹوزرداری)۔شہدائے سانحہ سکرنڈ کے لواحقین کو بھی سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے جمہوریت کی خاطر اپنے پیاروں کی قربانی کو صبر وتحمل سے برداشت کیا (بلاول بھٹو زرداری)۔شہدائے سانحہ سکرنڈ کے لواحقین کا صبر عزم اور حوصلہ جیالوں کا خاصہ ہے (بلاول بھٹو

زرداری)۔ پاکستان پیپلز پارٹی اپنے شہدا کی قربانیاں رائیگاں نہیں جانے دے گی (بلاول بھٹو زرداری)۔شہید بھٹو اور شہید محترمہ بے نظیر بھٹو کے مشن کو پایہ تکمیل پر پہنچائیں گے۔ پاکستان میں جمہوریت کو نا قابلِ تسخیر بنائیں گے (بلاول بھٹو زرداری)۔

اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

اورنگزیب ظفر خان پاکستان پیپلز پارٹی کینیڈا

چیئر مین بھٹو شہید کی پھانسی کے بعد ڈکٹیٹر شپ کا گھٹا ٹوپ اندھیرا خوف کے گہرے سائے۔لوگ سیاست پر بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے لوگ سوچتے تھے کہ چیئر مین بھٹو شہید کی پھانسی کے بعد مارشل لاء کی یہ کالی رات کبھی بھی نہ ختم ہوگی کوئی دوسرا بھٹو جنم نہ لے گا مگر پی پی پی کے جوان میدان میں اترتے ہیں چیئر مین بھٹو شہید کی پھانسی ان پر قرض تھی جسے چکانا فرض تھا کوئی جنت کا جھانسہ نہیں۔صرف عشقِ بھٹو ہے۔مارشل لاء کا سکوت ٹوٹتا ہے اور مارشل لاء کے خلاف جمہوریت کی بحالی کی تحریک شروع ہوتی ہے۔ ہزاروں کارکنان شاہی قلعہ قلعہ بالا حصار اور دیگر عقوبت خانوں میں بے پناہ ظلم وستم اور تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔جیلیں بھر جاتی ہیں۔جدوجہد اور بھی

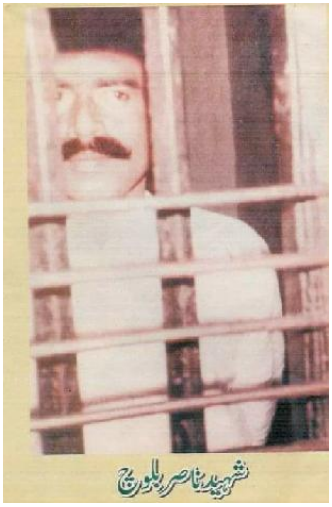

بھرپور طریقے سے آگے بڑھتی ہے۔جب لمبی لمبی سزاؤں سے پاکستان پی پی پی کے کارکنان خوف زدہ نہیں ہوتے۔پھر پھانسیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔6اور 9اگست 1984ء پنجاب کے ان بہادر اور دلیر کارکنوں کو پھانسیوں پر لٹکا دیا جاتا ہے۔آفرین ان جیالوں پر ہمیں فخر ہے اپنے ان شہدا پر جو جب پھانسی کے لیے کوٹھڑیوں سے نکالے جاتے ہیں تو پھانسی گھاٹ تک جیوے جیوے بھٹو جیوے کے نعرے لگاتے ہوئے تختہ دار کو چوم جاتے ہیں۔

6اگست 1984ء عثمان غنی اور ادریس طوطی کو لاہور جیل 9اگست 1984ء کو ادریس بیگ کو راولپنڈی میں پھانسی دی گئی۔

جیالے یہ پوسٹ اپنے کمنٹس کے ساتھ شیئر کر کے ان قربانی دینے والے بہادر کارکنان کو ضرور خراج تحسین پیش کریں۔

مجھے جہلم سے جیل اڈیالہ

شفٹ ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے ملک غلام مصطفی کھر پہلے سے وہاں (لیاقت باغ فائرنگ کیس) میں موجود تھے۔کھر کے جیل کے ایک دوست حیدر جو سابق ایئر فورس آفیسر تھے۔کبھی کبھار ملنے

آتے انہوں نے ایک دن کہا کہ یار سب قیدی کھر صاحب سے ملنے جاتے ہیں آپ لوگ کیوں نہیں کھر صاحب سے ملتے میں نے کہا کہ وہ نیشنل پیپلز پارٹی لیڈر ہیں ہمارے نہیں۔انہوں نے کہا بحر حال وہ بھٹو کے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں وہ خود کہہ رہے ہیں کہ ملنا چاہتے ہیں تو ان کی دعوت پر ہم لوگ ملنے گئے انہوں نے ملاقات میں کہا بات یہ کہ میں پی پی پی میں شامل ہونا چاہتا ہوں چند روز میری رہائی میں ہیں آپ میرا ساتھ دیں ہم لوگوں نے کہا ٹھیک ہے ہمیں خوشی ہے کہ آپ دوبارہ واپس آجائیں انہوں نے کہا میں چاہتا ہوں میں جب رہا ہوں تو جیل کے باہر پارٹی کارکن میرا استقبال کریں۔ہم نے کہا ٹھیک ہے اگر آپ رہائی کے جلوس کے ساتھ جاتے ہوئے راستے میں پھانسی پانے والے پارٹی کے کارکن ادریس بیگ کی قبر پر ڈھیری حسن آباد فاتحہ پڑھتے ہوئے جائیں انہوں نے ایسا ہی کیا۔جیل میں میرے علاوہ شیخ عبدالقیوم، اسلام الدین ایڈووکیٹ علی حیدر شاہ (سندھی) ریاض ساجد بھی موجود تھے

شاہدہ جبین

کامریڈ شاہدہ جبین پاکستان پیپلز پارٹی کی پہچان ایک تصویر 1985ء اور دوسری 2018ء کی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء سے لے کر اب تلک 40 سالہ طویل جدوجہد کا سفر شاہی قلعہ لاہور سے لے کر پنجاب کی جیلوں میں قید و بند صعوبتیں ہی نہیں برداشت کیں اپنی سات بہنوں کے بعد پیدا ہونے والے 20 سالہ نوجوان بھائی عثمان غنی شہید کی لاش کوٹ لکھپت جیل کے پھانسی گھاٹ سے اپنے کندھے پر اٹھا کر گھر لے کر آئیں جو جیوے جیوے بھٹو جیوے کے نعرے لگاتا تختہ دار پر گیا۔ آج جب پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے سینٹ کی ٹکٹوں کے خواتین کے نام پڑھ رہا تھا تو سوچا کہ سینٹ کی ٹکٹ ہو یا قومی اسمبلی میں خواتین نشستوں پر نامزدگی کی صرف امراء اور جاگیرداروں بڑے سیاسی خاندانوں کی بیگمات ہی اس کی اہل ہوتی ہیں جن کا کام بن ٹھن کر منہ بند کر کے صرف نشستوں پر بیٹھنا ہوتا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی یہ تو بڑے فخر سے کہتی

ہے کہ آج جو جمہوریت ہے وہ شاہدہ جبین جیسے کارکنوں کی بدولت ہے مگر کس کے لیے اور کب تک۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو چاہیے کہ وہ اپنے حق اور شاہدہ جبین کے حق کے لیے آواز بلند کریں

۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت اگر پنجاب میں اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہے تو کارکنوں کے سنگینوں کے سائے میں مارشل لاء کیخلاف جمہوریت کی بحالی کی تحریک میں

انسانی آزادیوں کی جنگ لڑتے ہوئے ایک بھرپور آواز کا مریڈ شاہدہ جبین جس کی آواز کو شاہی قلعہ کی بلند و بالا دیواریں بھی نہ دبا سکیں سلام ہے شاہدہ جبین کو اس لازوال قربانیوں اور جدوجہد کو جو آج 40 سال گزرنے کے باوجود بھی میدان عمل ہے۔

دو تاج ایک سونے کا تھا تو دوسرا سگریٹ کی پنیوں سے بنایا ہوا تاج۔ سگریٹ کی پنیوں سے بنایا ہوا تاج پاکستان پیپلز پارٹی کے جیالے عثمان غنی شہید نے پھانسی سے قبل اپنی آخری ملاقات میں اپنی کامریڈ بہن شاہدہ جبین کو دیا تھا کہ جب محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ہمارے گھر تعزیت کے لیے آئیں تو انہیں میری طرف سے پہنانا۔ پہلی تصویر میں فرخ سہیل گوئیندی بی بی بے نظیر ،شاہدہ جبین محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کو پھانسی کی کوٹھڑی میں بنا تاج پہنا رہے ہیں تو دوسری تصویر میں شاہدہ جبین سونے کا تاج پہنے ہوئے ہے جو انہیں 10 اپریل 1986ء میں مینار پاکستان کے جلسے میں پہنایا گیا تو محترمہ بے نظیر بھٹو شہید نے وہ سونے کا تاج شاہدہ جبین کو پہنا دیا کہ یہ میرے سے زیادہ اس تاج کی حقدار ہیں۔ شاہدہ جبین کے بھائی عثمان غنی شہید کو جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء

میں دیگر ساتھیوں ادریس بیگ شہید اور ادریس طوطی کے ہمراہ پھانسی دی گئی تھی جبکہ شاہدہ جبین خود بھی سال ہا سال شاہی قلعہ اور جیلوں میں رہیں۔آج جیل کی ڈائری کھولی تو اس میں شاہدہ جبین کا تاج پہنے یہ اخباری تراشہ نکل آیا۔

50 سالہ تاریخ

پاکستان پیپلز پارٹی کی 50 سالہ تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو خون اور آنسوؤں سے لکھی لازوال قربانیوں اور جدوجہد کا سفر ہے کہیں خودسوزیاں کرنے والے پروانوں کے جھلستے جسموں سے بھٹو کو رہا کرو کی صدائیں گونجتی نظر آئیں گی تو کہیں دار کی خشک ٹہنی پر لٹکتے چومتے پھانسی کے پھندوں میں سے نعرہ مستانہ جیوے جیوے بھٹو جیوے بلند ہوتا ہے۔

ننگی پیٹھوں پر کوڑے کی جھنکار سے کمر سے رستے خون سے جب تک سورج چاند رہے گا بھٹو تیرا نام رہے گا۔غرض عشق بھٹو سر چڑھ کے بولتا ہے۔پاکستان پیپلز پارٹی کی تاریخ میں دیکھا تو یہ صرف انفرادی طور پر کارکنوں کی جدوجہد نہیں تھی اس تحریک میں کہیں ڈاکٹرز بیدہ ملک، کامریڈ رفیع ملک مرحوم (فیصل آباد) ماں بیٹا دونوں شاہی قلعہ کے عقوبت خانے میں لائے جاتے ہیں تو کہیں کامریڈ شاہدہ جبین اپنے بھائی عثمان غنی شہید کے ساتھ جیلیں کاٹتی نظر آتی ہیں۔کوٹ لکھپت جیل کے ایک احاطے میں کامریڈ طلعت جعفری قید ہیں تو دوسری طرف ان کے والد محترم فضل الٰہی

شکیل ۔اس طرح ڈسکہ سیالکوٹ کے سید سلیم عباس اور ان بزرگوار بڑے شاہ جی ۔آصف بٹ ایڈووکیٹ اپنے بھائی ناصر بٹ کے ساتھ قید کا عذاب جھیلتے ہیں ۔فیصل آباد کے محمد اعظم بٹ اور پرویز اعظم بٹ دونوں بھائیوں نے بھی برابر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں ۔جنرل ضیاء کا ظالمانہ دور ایک سے بڑھ کر ایک ظلم کی داستان ہے لیکن ان سب میں ایک عشق بھٹو میں قربان کر دیا۔جی ہاں لاہور کے آغا برداران مارشل لاء کے شروع ہی سے ان کا گھر پاکستان پیپلز پارٹی کا گڑھ تھا۔ایک نہیں دو نہیں تین نہیں آدھ درجن سے زائد بھائی بہنیں سب پاکستان پیپلز پارٹی کی جدوجہد میں عملی طور پر میدان میں آئے ۔کوٹ لکھپت جیل میں میرے ساتھ جیل کے کمرے میں آغا مبین سے ان کی والدہ ملنے آئیں تو مبین نے کہا امی آپ ہر ہفتے جیل چلی آتی ہیں ۔پیسے خرچ ہوتے ہیں تو اس وقت مجھے رونا آ گیا جب انہوں نے کہا ہستا بستا گھر تھا۔تمہارے والد اور بہنوئی

شاہی قلعہ میں ہیں تم تین بھائی آغا مبین ،آغا نوید،آغا تنویر جیل میں ہو۔آغا ندیم ،آغا وسیم ،مفرور گھر میں صرف تمہاری بہن اور میں اکیلی ہوں کیا کروں گھر کھانے کو دوڑتا ہے۔لاہور کیا پاکستان بھر میں بحیثیت فیملی اگر کسی گھر کی قربانی دیکھی جائے تو آغا برادران سے بڑھ کر کوئی نہیں ان کی جدوجہد کی کہانی پر پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے ۔کسی شاعر نے شاید پاکستان پیپلز پارٹی کی جدوجہد پر ہی کہا ہوگا۔

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے

جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

محمد بوٹا کھوکھر، مرحوم نسیم اقبال اور میں بقلم خود سینٹرل جیل ساہیوال 1985ء.....وہ وقت جو مرحوم ساتھی محمد بوٹا کھوکھر کے ساتھ گزرا۔We miss you.....کوٹ لکھپت جیل کے گھٹن زدہ پھانسی پہرہ بلاک نمبر 2 سے نکل کر جب ہم عمر قید کی سزا کے ساتھ آدھی رات ساہیوال پہنچے تو صبح سویرے سپرنٹنڈنٹ جیل غلام سرور لعلوانی کے سامنے ملاحظہ ہوا۔اس نے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی کہ آپ کی 25 سال قید سخت ہے جس کا مطلب مشقت کرنا ہوتا ہے اسی بات پر پھڈا ہوا ہم میں کوئی بھی مشقت کرنے کو راضی نہیں تھا۔سپرنٹنڈنٹ جیل نے 14 چکی (قصور چکیاں) منتقل کر دیا گیا۔یہ جیل کے اندر جیل ہوتی ہے ہمارا پرانا ہتھیار کام آیا روٹی آئی تو سب نے واپس کر دی۔یعنی بھوک ہڑتال جب آئی جی جیل خانہ جات تک اطلاع پہنچی انہوں نے فوری طور پر قصوری چکیوں سے نکالنے کا حکم صادر فرمایا۔رات گئے جب لوڈ شیڈنگ تھی لالٹین کی روشنی میں ہمیں ایک دوسرے احاطہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے ہمیں کھول دیا گیا۔1876ء انگریزوں کے زمانے کی بنی ہوئی اس جیل کے احاطے بہت بڑے تھے جیل کی چکیاں بڑی تھیں۔دروازوں پر TATA india لکھا ہوا تھا۔پھر کچھ عرصہ بعد ہمیں 6 چکی جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں منتقل کر دیا گیا یہاں کی خاص بات یہ تھی کہ فیض احمد فیض بھی پنڈی سازش کیس میں یہاں قید کاٹ چکے تھے۔اس 6 چکی میں فیض احمد فیض کا نسخہ ہائے وفا میرے سرہانے رکھا ہوتا اس کی شاعری خصوصاً زنداں نامہ پڑھتے وقت ایک عجیب سی کیفیت ہوتی جیسے یہ ہمارے لیے ہی لکھی ہو۔آئی جی جیل خانہ جات دورے پر آئے تو انہوں سپرنٹنڈنٹ جیل سے کہا یار حکومت جو مرضی کہے ہیں تو یہ سیاسی قیدی انہیں ہر ممکن سہولیات فراہم کرو۔اس کے بعد قید تو تھی مگر وقت اچھا گزرنے لگا وقت کے ساتھ ساتھ ہم بھی سمجھوتہ کر چکے تھے کہ جب تک جنرل ضیاء الحق ہے ہمیں جیل میں رہنا ہے۔وقت تیزی سے گزرنے لگا دن کتابیں پڑھنے اور ایکسرسائز اور دوستوں سے گپ شپ میں گزر جاتا۔ساتھ ساتھ میرے جیسے دوستوں کی تعلیم جو ادھوری رہ گئی تھی پڑھنا بھی شروع کیا بہت سے جیالوں نے میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے تک کے امتحان دیے۔

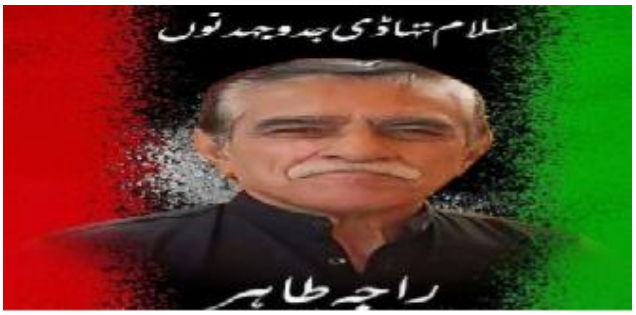

بھٹو کیسے زندہ ہے اور کیوں زندہ رہے گا

AGAINST ALL ODDS

ڈاکٹر مبشر حسن اور عشق بھٹو

زوار حسین کا مرید

زیر نظر تصویر دو سال قبل ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر پر ان کے انٹرویو کے بعد سیاسی کارکن وفوٹو جرنلسٹ طاہر محمود مودی نے کھینچی تھی ۔ یہ وہی در و دیوار تھے جہاں شہید بھٹو نے قیام کیا تھا۔ وقت ہمیں یہ اعزاز دے رہا تھا کہ ہم قائد عوام کی موجودگی کے لمس سے سرشار ہو سکیں ۔ انٹرویو کے لیے روانہ ہونے سے پہلے شہید بھٹو کی رومانیت مجھے اپنے اندر گہری ہوتی محسوس ہونے لگی تھی ۔ دوران انٹرویو میرے سوال کے جواب میں جب ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ جس کمرہ میں ہم نشست جمائے ہوئے ہیں اسی میں شہید بھٹو قیام کرتے تھے۔ حتی کہ ڈاکٹر صاحب کے زیر استعمال آج بھی وہی بیڈ ہے جس پر شہید بھٹو سویا کرتے تھے۔ جیسے جیسے یہ احساسات بڑھتے جاتے تھے کہ ہم اپنے ہیرو کی یادوں سے سجے تاریخی کمرہ میں بیٹھنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں ۔ ویسے ویسے بھٹو صاحب کا سحر ہم پر غالب ہوتا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹہ سے زائد جاری رہنے والی نشست کا ایک ایک لمحہ میرے اندر شہید بھٹو کے رومانس کے دیپکوں کی تعداد میں اضافہ کر کے عشق بھٹو کے خمار کو بلندیوں پر پہنچا رہا تھا۔ مستی وخمار کی اس کیفیت میں گو ہم واپس آ گئے مگر کئی ہفتوں تک شہید بھٹو کا لمس ہمارے ساتھ موجود رہا۔ دو دن قبل ڈاکٹر صاحب کی رحلت کے بعد متذکرہ لمحات انٹرویو والے دن کی طرح مجھ پر غالب آنے لگے تو مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ دنیا سے رخصت تو ڈاکٹر مبشر حسن ہوئے ہیں مگر یاد شہید بھٹو کیوں آ رہے ہیں ۔ ابھی آخر شب کے لمحہ میں میرے سوالوں کا جواب میرے دل و دماغ نے دیا کہ انٹرویو والے دن گو ڈاکٹر مبشر حسن کی سینارٹی شہید بھٹو سے رفاقت میرے لیے متاثر کن تھی۔ مگر ان کی شخصیت کا سب سے بڑا پہلو جوان کا احترام بڑھا رہا تھا وہ ان کی شہید بابا سے نسبت تھی سو محبت کا محور صرف اور صرف شہید ذوالفقار علی بھٹو ہیں اور رہیں گے جبکہ ان کے دور کی شخصیات سے محبت بھٹو صاحب کے لمس کی بنا پر ہوتی ہے۔

تمہارے لمس کو خود میں اتار سکتا ہوں
میں اپنے آپ کو یوں بھی سنوار سکتا ہوں

وہ سانس سانس میں گھلنے لگے ہیں یوں میرے
میں پور پور سے ان کو پکار سکتا ہوں
مرے خیال کی طاقت سے تم نہیں واقف
زمین پر میں فلک بھی اتار سکتا ہوں
مرے مزاج کی شدت سے تم تو واقف ہو
تمہیں میں اپنا بنا کر بھی ہار سکتا ہوں
اگر جو اذنِ محبت مجھے ملے تم سے
میں روم روم تیرا بھی نکھار سکتا ہوں

شاعری،صائم جی

سیاسی اسیران

نومبر 88 کا الیکشن ہماری رہائی کی نوید لے کر آیا تھا۔ دسمبر 1988ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کے حکم پر جیل کوٹ لکھپت 8 سال بعد رہا ہونے والے سیاسی اسیران اور شاہی قلعہ کے وہ سیل جہاں سیاسی قیدیوں کو رکھا جاتا تھا تصاویر کے لیے میرے ساتھ محمد صابر کا شکریہ.....ان میں سے چار دوست میاں جہانگیر ایڈووکیٹ، اسلم لدھیانوی، امجد حسین، راوی اشفاق علی، امجد حسین، راؤ اشفاق علی اب دنیا میں نہیں رہے۔

بھٹو کہانی

بھٹو کہانی میں نے آج تک چیئر مین بھٹو شہید کے متعلق اتنی جامع اور مکمل وڈیو نہیں دیکھی نوجوان نسل تو اپنی جگہ۔ پرانے لوگوں کے لیے بھی بہت سی نئی باتیں اس وڈیو میں موجود ہیں فرخ سہیل گوئیندی نے اتنی محنت کی ہے مجھے تو کوئی کمی نہیں لگتی اسے دیکھنے کے بعد خصوصاً نوجوان نسل سمجھ سکتی ہے کیونکہ آج تک پاکستان کی سیاست چیئر مین بھٹو شہید کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی بھٹو جو میرا فرخ سہیل گوئیندی اور ہزاروں لاکھوں جیالوں کا عشق تھا رومینس تھا عشق ہی تو تھا جو پروانے اپنے آپ پر تیل چھڑک کر آگ لگا لیتے تھے۔ جوان جیوے جیوے بھٹو جیوے کے نعرے لگاتے ہوئے تختہ دار چوم جاتے تھے۔ ننگی پیٹھوں پر لگنے والے ہر کوڑے پر چیخنے کے بجائے جیے بھٹو کے نعرے لگاتے تھے۔ وہ عشق آج بھی قائم دائم ہے احمد فراز نے کیا خوب کیا ہے

ہم محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں فرازؔ

ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھنا

یہ بھی وقت تھا

یہ بھی ایک وقت تھا

ہماری مائیں ہماری بہنیں عید سے پہلے ہماری رہائی کے لیے مظاہرے کیا کرتی تھیں ہماری مائیں بھی کسی میکسم گورکی کی ماں سے کم نہیں تھیں۔

آج حالات اس سے بدتر ہیں اب تو سیاسی قیدیوں کو غائب ہی کر دیا جاتا ہے مصطفی کانجو کو غائب کیے ہوئے پانچ مہینے ہو گئے ابھی تک کچھ پتہ نہیں کہ زندہ بھی ہے کہ نہیں۔تصویر میں میری ماں شیخ عبدالقیوم کی بھتیجیاں اور دبنگ جیالی خالی سکینہ بادشاہ مرحومہ نمایاں ہیں جن کی بیٹی کی

وڈیو نیب ہیڈ کوارٹر کے باہر پولیس سے دست بدست لڑتے ہوئے وائرل ہوئی تھی۔ 1986ء کمیٹی چوک راولپنڈی

54 جیالے

5 مارچ 1985ء ناصر بلوچ کی پھانسی اوور کوٹ لکھپت جیل میں الذوالفقار سازش کیس میں 54 چیئرمین بھٹو شہید کے جیالوں کو سزائے موت پھر عمر قید میں تبدیلی۔

(پاکستان کی سیاسی تاریخ کے سب سے بڑے سیاسی مقدمے کا آغاز بھی تین سیاسی کارکنوں ادریس بیگ شہید عثمان غنی شہید و ادریس طوطی شہید کو پھانسی لگا کر کیا گیا فیصلے کے دن بھی

ناصر بلوچ کو پھانسی دی گئی۔

4/5 مارچ 1985ء کی درمیانی شب تھی صبح ہماری ملاقات کا دن تھا۔ جو کہ ہفتے میں ایک بار 30 منٹ کے لیے ہوتی تھی۔ میں اپنیسیل میں بیٹھا سر پر تیل کی مالش کر رہا تھا کہ ثقلین شاہ (چیف چیکر جو جیل کے تمام احاطوں کا انچارج ہوتا ہے) معمول کی گشت پر میرے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے رک گیا۔ ثقلین شاہ جیل کے اچھے افسروں میں شامل تھا۔ وہ چیئرمین بھٹو شہید کا ہمدرد تو تھا ایک واقعہ کے بعد گرویدہ ہو گیا یوں کہ ہمارے مقدمے کی سماعت کے دوران محرم کا مہینہ آ گیا۔

ہم 54 ساتھیوں کو پھانسی پہرہ بلاک نمبر دو سے سپیشل ملٹری کورٹ لے جایا جاتا تھا جو کہ جیل کے آخری کونے میں جہاں فیکٹری تھی وہاں خصوصی طور پر نئی تعمیر کی گئی عمارت تھی۔ایک

بہت بڑا ہال جس میں بیٹھنے کیے لیے لکڑی کے بینچ اور سامنے جج ایک برگیڈیئر ایک کرنل ایک مجسٹریٹ اور اس کا عملہ۔ درمیان میں دس فٹ کا جنگلہ تا کہ ہم جج پر حملہ نہ کر سکیں۔ برگیڈیئر سے

بات کرنے کے لیے سپیکر اور مائیک کا استعمال ہوتا محرم الحرام میں جب ہمیں فوجی عدالت میں لے جایا جاتا تو 54 قیدیوں کو بیڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ایک ہتھکڑی دو قیدیوں کو لگائی جاتی تو اس طرح 54 قیدیوں کی دو دو قیدیوں کی لائن بنا کر روانگی ہوتی جیل کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک خاصہ فاصلہ تھا۔ 54 میں سے کوئی 20-22 سیاسی قیدی شیعہ تھے۔انہیں محرم میں ایک جگہ اکٹھے ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔(عام قیدیوں کو ہوتی تھی) تو جب ہم پھانسی بلاک سے نکلتے وہ اپنے مرثیے نوحے پڑھنا شروع کر دیتے تو چلتے ہوئے پاؤں میں بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی جھنکار اور مرثیہ نوحہ خوانی اور ماتم کی آوازیں اتنی بلند بلند ہوتی کہ پوری جیل گونج اٹھتی۔ثقلین شاہ جو ہمارے ساتھ اپنے سپاہیوں کو لے کر چل رہا ہوتا رو پڑتا اور کہتا کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں ایسا ماتم بیڑیوں ہتھکڑیوں سمیت نہیں دیکھا۔اس کے بعد وہ ہمارے زیادہ قریب آ گیا اور خاصا خیال رکھتا۔

بہر حال جب وہ اس رات میرے کمرے کے سامنے کھڑا ہوا تو کچھ اداس لگ رہا تھا عموماً ہنستے مسکراتے ہوئے ملتا۔رات میں عموما میں بھی کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا اس رات وہ پوچھنے لگا آج کچھ پڑھ کیوں نہیں رہے۔میں نے کہاں صبح کراچی جیل میں ہمارے ایک دوست ناصر بلوچ کو پھانسی ہونی ہے۔اس لیے دل اداس ہے۔وہ کہنے لگا جنرل ضیاء الحق سے خیر کی توقع نہیں۔میں دعا ہی کر سکتا ہوں اسے پتہ تھا کہ شاید آج ہمارا فیصلہ ہونا ہے اس لیے بہت تسلیاں دے رہا تھا کہ جب تمہارے مقدمے کا فیصلہ ہو تو ہمت جرأت سے سامنا کرنا پھر وہ چلا گیا۔کچھ دیر بعد جب میں سو گیا تو مجھے جیل میں کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔آنکھ کھلی تو سیل کے باہر پنجاب پولیس کے سپاہی کھڑے تھے (جیل کی اپنی پولیس ہوتی ہے) ایک سپاہی نے ہتھکڑی باہر ہی سے میری طرف بڑھائی کہ کمرے کے اندر ہی ہتھکڑی لگا کر باہر نکلنا ہوگا اور کہا کہ تمہیں کسی دوسری جیل میں منتقل کیا جائے گا۔میں سمجھ گیا کہ مقدمہ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔مگر آدھی رات کو؟ احاطے کے باہر نکلے تو ہم چودہ

لوگ تھے باقی ابھی بند تھے۔ جب میں نے نظر دوڑائی تو چودہ وہ دوست تھے جو دہ وہ دوست تھے جو جیل کے کھاتے اور فوجیوں کی لسٹ میں خطرناک ترین قیدی تھے۔ان کی تصویر پوسٹ کے بعد نیچے لگاؤں گا۔اتنے میں حامد سعید پیا مرحوم میرے پاس آیا اور کہنے لگا دیکھنا راولپنڈی کی بے عزتی نہ کروانا اگر سزائے موت ہوتی ہے تو حوصلے سے رہنا۔میں نے اسے ہنستے ہوئے کہا کہ مجھے تمہاری فکر ہے تم مجھے کیا نہیں جانتے۔خیر ہم سب کو پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ جیل کے پھانسی پہرہ بلاک نمبر دو سے نکلے پولیس والے ہمیں جیل کی دیوڑھی کی طرف لے گئے پولیس کا قیدیون کو لے جا نے والا ٹرک باہر کے بجائے اندر ہی کھڑا تھا۔ہم نے پوچھا کہاں جانا ہے۔ایک افسر نے کہا فیصلہ ابھی آنا ہے۔ہم لوگ تو ذہنی طور پر تیار تھے کہ سزائے موت ہی ہونی ہے اور تمام بڑے اعتماد اور حوصلے میں تھے کہ جو ہوگا بہادری اور دلیری سے سامنا کرنا ہے۔جیسے ہمارے سے پہلے پھانسی پانے والے دوستوں نے کیا۔اتنے میں جیل سپرٹنڈنٹ کا دروازہ کھلتا ہے۔مسعود انور قریشی سپریٹنڈنٹ بلند آواز میں بولا کہ مبارک ہو فوجی عدالت نے تم لوگوں سمیت 36 افراد کو سزائے موت اور 18 کو عمر قید کی سزا سنائی تھی۔مگر ابھی ابھی گورنر پنجاب (جنرل غلام جیلانی جو سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھا) نے تمام سزائے موت کے قیدیوں کی سزا بھی عمر قید میں بدل دی ہے۔یہ اپنی نوعیت کا منفرد فیصلہ تھا جو جج کے بجائے سپریٹنڈنٹ جیل نے بتایا۔فوجی عدالت دن کو لگ چکی تھی اور جج نے ہماری غیر موجودگی میں فیصلہ سنانے کے بعد گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان کو بھجوایا جیسا اسے حکم تھا۔گورنر نے سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی۔

سپریٹنڈنٹ جیل فیصلہ سناتے ہی جیل کی ڈیوڑھی میں جیوے جیوے بھٹو جیوے کے فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگے۔ہم آپس میں ایک دوسرے کے گلے ملے ایک نئی زندگی مل رہی تھی ۔کیونکہ ہم نے اپنے ساتھیوں کو پھانسی لگتے دیکھا تھا ہم تو ذہنی طور پر تیار تھے بلکہ پھانسی کے بعد اجتماعی قبر کا سوچا پھر فیصلہ تبدیل کیا کہ پنجاب کے مختلف شہروں سے درجنوں جنازے اٹھیں گے تو کیا

سماں ہوگا۔ ہماری اگلی منزل ساہیوال جیل تھی۔شام کو بی بی سی نے فیصلے کی خبر سنائی تو دوسرے دن میرے ابا جی اور ماں جی ساہیوال جیل پہنچ گئے دوسری طرف ساہیوال جیل میں موجود بہت ہی پیارے دوست انور بیگ نے کسی سپاہی کو پیسے دے کر راولپنڈی فون کروادیا تھا۔ ماں نے ملتے ہی کہا منہ کھولو اور مٹھائی میرے منہ میں ڈال دی میں نے کہا یہ کیا مجھے عمر قید ہوئی ہے آپ مبارک باد اور مٹھائی کھلا رہے ہیں۔انہوں نے کہا میں ان پڑھ ضرور ہوں مگر اتنا شعور رکھتی ہوں کہ تمہیں سزائے موت ہونی تھی۔ادریس بیگ تمہارے بچپن کے دوست کی لاش ہم پھانسی کے بعد اپنے ہاتھوں سے دفنا چکے ہیں۔عمر قید ہوئی جب تک جنرل ضیاء الحق زندہ ہے۔تم جیل میں ہو جس دن یہ مرے گا تم باہر ہو۔ٹھیک تین سال بعد جنرل ضیاء الحق کا جہاز ہوا میں پھٹ گیا اور پاکستان پیپلز پارٹی الیکشن جیت گئی۔محترمہ بے نظیر بھٹو شہید نے پہلی نشری تقریر میں ہم مارشل لاء کے سیاسی قیدیوں کی رہائی کا اعلان کر دیا۔

آج جب دوستوں کے اصرار پر کچھ لکھنے کی ابتدا کی تو کچھ دیر بعد قلم رک گیا۔آٹھ سالہ قید کسی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔جو دوست بچھڑ گئے مر گئے پھانسی لگ گئے شدت سے یاد آئے کیسے کیسے نگینے بہادر خوبصورت ساتھی بھٹو کے نام پر کٹ مرنے والے جنہیں دیکھ کر حوصلہ بڑھتا تھا خون جوش مارتا تھا۔لڑنے مرنے کو جی چاہتا تھا۔لالہ اسد شہیدؒ انجم شہید ایاز سموں لالہ اسلم پٹھان شہید،عبدالرزاق جھرنا شہید کس کس کو یاد کروں میں زندگی میں شاید چند مرتبہ ہی رویا ہوں وہ بھی کسی کے سامنے نہیں آج بھی اکیلے میں بچوں کی طرح رویا ہوں کہ وہ کبھی نہ بھولنے والے ساتھی تھے۔آپ کے اور دیگر دوستوں کے کہنے پر اپنی یادشتوں کو سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔مشکل کام ہے اس لیے نہیں کہ لکھنا مشکل ہے تلخ یادیں تکلیف دہ ہوتی ہیں یاد کرنے پر دل خون کے آنسو روتا ہے

اورنگزیب ظفر خان ضمیر کا قیدی

اورنگزیب ظفر خان

my pic.Death cell kot lakhpat jail

Lahore ...kot lakhpat sazish case ..gen..zia

martial law...1984...with my 53 PPP

Political psisners

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اور جہاز پھٹ گیا

اور جہاز پھٹ گیا۔

پہلی اور آخری بار غلام اسحاق خان اچھا لگا اور جہاز پھٹ گیا کی وجہ سے میری رہائی جو 2009ء میں 25 سال بعد ہونی تھی۔ 1988 میں ہوگئی۔

17August1988

ہم لوگ اڈیالہ جیل راولپنڈی میں تھے جیل کی گنتی بند ہو چکی تھی کہ اچانک جیل کے اندر عام قیدیوں کے نعروں کی آواز گونجنے لگی۔ میں جیل کی ڈیوٹی پر موجود سپاہی سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے کہا اڑتی اڑتی خبر آئی ہے کہ جنرل ضیاء الحق کا جہاز کریش ہو گیا ہے پاکستانی خبریں تو ہم کم ہی سنتے تھے اس دن ریڈیو لگایا تو جنرل ضیاء الحق کے مرنے کی خبر تھی۔ کانوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اپنی ماں یاد آ گئی جب میری سزائے موت عمر قید میں تبدیل ہوئی تو وہ مٹھائی لے کر آئیں میں نے کہا مجھے 25 سال سزا ہوئی ہے وہ بولیں کہ زندگی بچ گئی اب مجھے پتہ ہے کہ جب تک جنرل

ضیا ہے تم جیل میں ہو۔ ہزاروں ماؤں کی سنی گئی ۔دسمبر 88 میں محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی حکومت بننے کے بعد پاکستان بھر کی جیلوں میں موجود ہزاروں سیاسی قیدی رہا ہوئے وگرنہ میری رہائی مارچ 2009ء میں 25 سال بعد ہونی تھی۔

محمد بوٹا کھوکھر

اے دنیا والو! گواہ رہنا ہم مرتے دم تک بھٹو والے ہیں۔اے قائد عوام ہم تمہاری پھانسی کا قرض چکانے تمہارے نقش قدم پر چلتے ہوئے تختہ دار تک آئے ۔نام محمد بوٹا کھوکھر۔ لاہور کینٹ کوٹ لکھپت سازش کیس کا ایک ملزم۔ جرم جنرل ضیاء الحق کا تختہ الٹنے کی سازش۔سزائے موت پھر عمر قید۔ مارشل لاء ایک باغی چیئرمین بھٹو شہید کا ایک جیالہ پنجاب کا ایک بہادر سپوت ہمت والا جرات والا کال کوٹھری شاہی قلعہ میں ہر وقت ہنستا مسکراتا چہرہ۔آج ہمیں رلا گیا۔ ہمارا ساتھ چھوڑ گیا۔

جیل سے خط

شاہی قلعہ سے جیل منتقلی کے بعد اگر کسی سیاسی قیدی کو خط لکھنے کی ضرورت پڑتی تو وہ ضرورت سپرنٹنڈنٹ جیل کے ہفتہ وار دورے کے دوران اجازت طلب کرتا ہے سپرنٹنڈنٹ صرف اپنے قریبی عزیز کو خط لکھنے کی اجازت دیتا۔ دورے کے فوراً بعد جیل کا منشی جو عموماً جیل کے پرانے قیدی ہوتے ہیں بھیجا جاتا وہ خط لکھتا۔ اس کے بعد وہ جیل کا کوئی افسر سینسر کرنے کے بعد سپرد ڈاک کرتا ہمیں خط لکھنا تو درکنار کاغذ پنسل رکھنے کی اجازت نہ تھی پھر بھی ہم بال پین کی ریفل چھپا کر رکھتے تھے اور سگریٹ کی پنیوں کو لیٹر پیڈ کے طور پر استعمال کرتے اور جو ملاقاتی آتے چھپا کر لے جاتے 1985ء جونیجو حکومت بننے کے بعد لکھنے پڑھنے کی مکمل آزادی مل گئی اس طرح عزیزوں دوستوں کو خط لکھنے لگے۔ پاکستان کی دوسری جیلوں میں مقید سیاسی قیدیوں سے رابطہ آسان ہو گیا ۔حتی کہ میری آسٹریا، ویانا میں قید اپنے جیالوں یعقوب چینا اور اور مرزا اختر بیگ سے خط و کتابت ہونے لگی۔ خاص خط پھر بھی باہر کسی دوست کے پتے پر منگوائے جاتے جبکہ عام خط جیل کے پتے پر

ہی منگوائے جاتے مگر جیل حکام خط کھول کر دیکھتے پھر اس پر سینسر کی مہر لگاتے اوپر خط میں وہ مبہم سی مہر نظر آتی۔

خطوط کا مزہ اس وقت آیا جب پوری دنیا سے تمام سیاسی قیدیوں کو ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ممبران کی طرف یک جہتی اور نیک خواہشات کے سینکڑوں ہزاروں کارڈز ملنے شروع ہوئے مغربی ممالک سے آئے ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ممبران ان خطوط کا جیل حکام پر بھی بہت اثر ہوا اور بہتر سے بہتر انداز میں پیش آنے لگے۔

میاں محمد جہانگیر ایڈووکیٹ مرحوم

فوجی ڈکٹیٹرشپ آمریت کے خلاف جدوجہد کا ایک اہم کردار۔ پہلے ہائی جیکر کی گرفتاری

میاں محمد جہانگیر ایڈووکیٹ طالب عملی کے زمانے سے ہی بائیں بازو کی سیاست میں متحرک ہوتے ہیں اور سول لائنز کالج لاہور طلبہ یونین کے الیکشن میں صدر منتخب ہوئے۔ 1979ء

میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کوٹلی پیر عبدالرحمن سے لاہور میونسپل کارپوریشن کے کونسلر کا الیکشن جیتا۔ جنرل ضیاء الحق کے خلاف مزاحمتی تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ فروری 1981ء میں سلام اللہ ٹیپو کابل سے لاہور آتے ہوئے لاہور میں میاں محمد جہانگیر ایڈووکیٹ سے ملتے ہیں لیکن میاں محمد جہانگیر ایڈووکیٹ کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ چند دن بعد سلام اللہ ٹیپو پی آئی اے کا جہاز اغوا کر کے کابل لے جائے گا۔ مارچ 1981ء میں میاں محمد جہانگیر ایڈووکیٹ کو گرفتار کر کے شاہی قلعہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہائی جیکنگ کا واقعہ نیا نیا تھا اس لیے انہیں بھی ہائی جیکرز کا ساتھی گردانا گیا۔ شاہی قلعہ کے عقوبت خانے میں بے پناہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد کوٹ لکھپت جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں پہلے ہی سے تیاریاں مکمل تھیں کہ ہائی جیکروں کا قریبی ساتھی آ رہا ہے جیل میں

سکیورٹی کے سخت انتظامات کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کے جتنے بھی کارکن گرفتار ہو کر جیل آتے رہے سب کو اس فہرست میں گنا جاتا تھا۔ جیل کے رجسٹر کاغذات میں انہیں ہائی جیکرز ہی کہا جاتا رہا۔ میاں محمد جہانگیر ایڈووکیٹ ہمارے جیل کے ان ساتھیوں میں سے تھے جنہیں استاد کا درجہ حاصل تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی تربیت میں ان کا بڑا حصہ رہا۔ بائیں بازو سے تعلق انقلابی سیاست اور جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔ شاہی قلعہ سے لے کر پنجاب کی جیلوں آٹھ سال کی قید کا سفر بڑی بہادری سے طے کیا۔ مارچ 1985ء میں ہم سب کے ساتھ ہی انہیں بھی کوٹ لکھپت جیل سازش کیس میں سزائے موت پھر عمر قید کی سزا ہوئی تھی لیکن زندگی

نے وفا نہ کی اور جلد ہی ہمیں چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔

آہ پی پی پی

کہتا ہے کون ختم ہوئی کربلا کی جنگ
ہم لڑ رہے ہیں آج بھی فوجِ یزید سے
آہ! پی پی پی

زخموں ،کوڑوں ،جیلوں ، پھانسیوں ،ڈنڈوں ، برچھیوں اور بھالوں کے وار سہنے کا ایک

لامتناہی سلسلہ قیادت سے لے کر ایک ورکر ایک جیالے تک قربانیوں کی نہ ختم ہونے والی داستان۔

راجہ طاہر

ایک پیارا بہادر مارشل لاء کے خلاف جدوجہد کا ساتھی مزاحمتی تحریک کا ایک کردار راجہ طاہر ہم سے بچھڑ گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ارکان میں سے پارٹی قیادت سے گلے شکوے ناراضگی مگر مرتے دم تک پاکستان پیپلز پارٹی کا ساتھ نہ چھوڑا ڈھیری حسن آباد میں سب سے اونچا پاکستان پیپلز پارٹی کا پرچم ان کے گھر ہی لگا نظر آتا۔ گھر میں داخل ہوتو چیئرمین بھٹو شہید کی پرانی تصاویر کے علاوہ کارل مارکس، لینن، سٹالن، چوئی این لائی، ماؤزے تنگ کی کپڑے پر بنی تصاویر

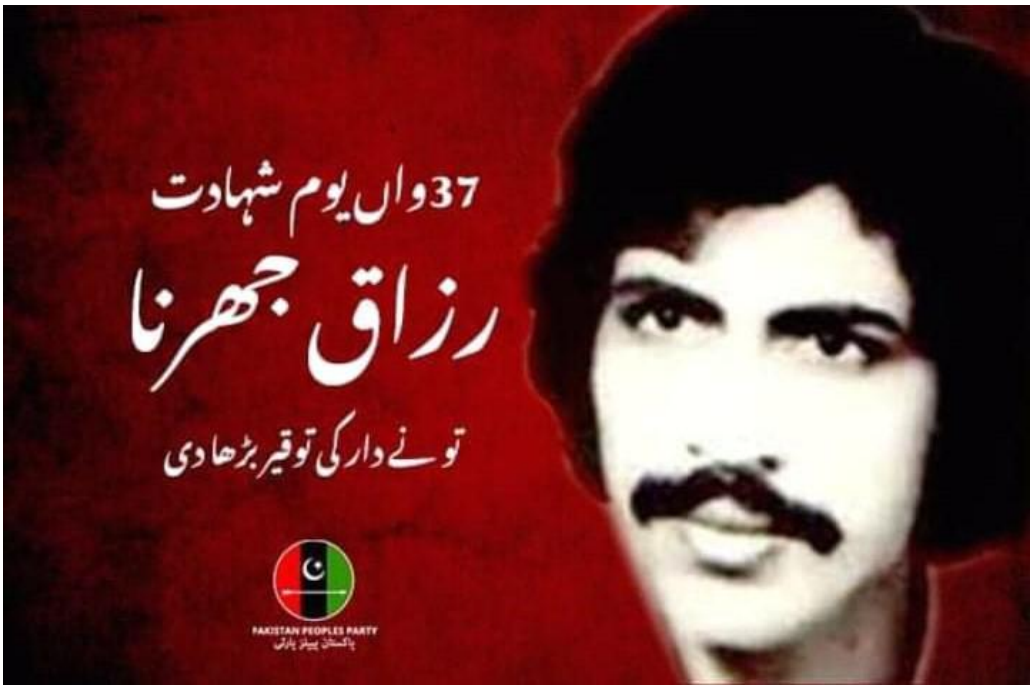

خوبصورت فریمز میں لگی نظر آتیں۔ پنجاب یونیورسٹی پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن PSF کا سرخار راجہ طاہر جسے دیکھ کر اسلامی جمعیت طلبہ والے رستہ بدل لیتے تھے چیئرمین بھٹو شہید، محترمہ بے نظیر بھٹو شہید اور میر مرتضی بھٹو شہید اور شاہ نواز بھٹو شہید کے ساتھی گرفتار ہوئے تو جنگ اخبار میں چار کالمی سرخی شاہی قلعہ لاہور منتقل ہوا تو ان کی ماں لاہور جا کر بیٹھ گئیں کہ بیٹے کو گھر واپس لے کر جاؤں گی باپ جو فوجی افسر رہے تھے میجر راجہ دولت زر ایک دبنگ آفیسر شاہی قلعہ کا انچارج برگیڈیئر رشید قریشی ان کا شاگرد تھا ناممکن کو بھی ممکن بنایا اور کئی ماہ تک شاہی قلعہ میں رہنے کے بعد بالآخر رہائی کروا کر چھوڑی ورنہ عمر قید کی سزا مقدر تھی۔ ہمیشہ ثابت قدم بابائے سوشلزم شیخ رشید مرحوم مفرور

ہوئے۔ پاکستان بھر کی پولیس ایجنسیاں ان کے پیچھے راجہ طاہر نے اپنے دروازے کھولے اور کئی ماہ تک اپنا مہمان بنائے رکھا۔ راجہ طاہر اپنی ذات میں پاکستان پیپلز پارٹی کی ایک تحریک اپنوں کو سوگوار چھوڑ کر چلا گیا۔ راجہ طاہر ہم تمہیں کبھی نہیں بھول پائیں گے۔ تم ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہو گے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی فوج ڈکٹیٹرز کے خلاف جدوجہد کی تحریک میں تمہارا نام ایک ہیرو کے طور پر لکھا جائے گا۔

چکی ساہیوال جیل 6

6 چکی

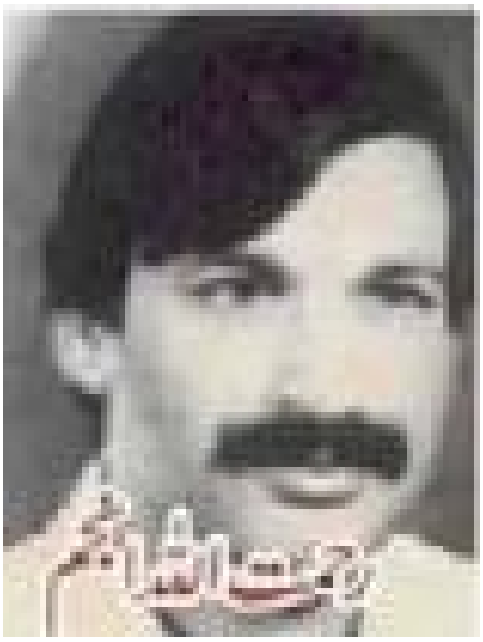

ساہیوال جیل جہاں پنڈی سازش کیس کے باغی فیض احمد فیض اور ان کے کامریڈوں نے قید کے دن گزارے اپنے ساتھی آصف بٹ ایڈووکیٹ کے ساتھ 1985ء کے خوبصورت دن تھے عمر قید کی سزاؤں کے باوجود ہنستے کھیلتے دن گزرتے تھے۔ جیلیں سیاسی کارکنوں کے لیے یونیورسٹی کا درجہ

رکھتی ہیں جہاں بہر حال کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ میرے جیل کے ساتھی میرا سرمایہ ہیں۔

آہ رانا عیش بہادر ایڈووکیٹ

نام کا بہادر نہیں حقیقت میں بہادر تھا۔ بہت لمبا سفر پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ ہمیشہ ثابت قدم ہمیشہ پرعزم شاہی قلعہ کے عقوبت خانے سے لے کر کوٹ لکھپت جیل تک مارشل لاء کا ایک باغی متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والا۔ لاہور جنرل ضیاء الحق کے خلاف مزاحمتی تحریک کا سب سے اہم مرکز لاہور کی کوئی گلی محلہ ایسا نہیں جہاں جیالوں نے اپنے خون سے جدو جہد کی تاریخ نہ لکھی ہو رانا عیش بہادر ایڈووکیٹ انہیں میں سے ایک تھا۔ ہم آپ کی قربانیوں اور بہادری کے قصے آنے والی نسلوں کو ضرور منتقل کریں گے۔ آپ ہمارے ہیرو پاکستان کی جمہوری تحریکوں کے ہیرو ہیں ہم آپ کو کبھی بھول نہیں پائیں گے۔ الوداع ہماری جاں گسل جدو جہد کے ساتھ الوداع

کراچی کا شیر

مرزا مقبول احمد

کراچی کا شیر مگر جس کی بہادری اور جرات کے قصے پنجاب کی جیلوں شاہی قلعوں کے عقوبت خانوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ دبلا پتلا سا خوبصورت جوان مرزا مقبول اپنے وزن سے بھاری بیڑیاں پہنے چھن چھن کرتا ہنستا مسکراتا کوٹ لکھپت جیل کے احاطے میں دندناتا پھرتا آج

بھی نظروں میں گھوم جاتا ہے تو اس کے لیے ڈھیروں پیار دل میں بھر جاتا ہے۔ عارف لوہار کے چمٹے کی طرح بیڑیاں بجاتے گنگناتے ہوئے:

جانے کیوں لوگ محبت کیا کرتے ہیں
دل کے بدلے درد دل لیا کرتے ہیں

گاتا تو محسوس ہوتا ہے کہ محبت کی کوئی ادھوری داستان جیل سے باہر چھوڑ آیا ہے۔ مرزا مقبول استاد مسرور احسن ہو غلام حسین چانڈیو یا مصطفی میمن ہو یا دیگر ساتھی اپنی گہری یادیں پنجاب چھوڑ آئے ہیں، جنہیں دوست آج بھی یاد کرتے ہیں ہم بھول بھی کیسے سکتے ہیں اپنے انمول ساتھیوں کو ۔سندھ والوان کی قدر کرو جس عزت و احترام کے قابل یہ لوگ ہیں انہیں ضرور دینا چاہیے۔ ایسے ہیرو زروز روز پیدا نہیں ہوتے۔

توقیر اکرم کائرہ

پاکستان پیپلز پارٹی وسطی پنجاب قمر زمان کائرہ کا توقیر اکرم کائرہ شہید کو شہید محترمہ بے نظیر بھٹو کی تحفظ کی خاطر 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ میں جام شہادت نوش کرنے پر سلام اور خراج عقیدت پیش کیا۔

اپنے پیغام میں ان کا کہنا تھا شہید رانی، شہید توقیر کائرہ سمیت تمام جمہوری شہیدوں کی وطن

عزیز میں جمہور، جمہوریت کی بحالی اور ایک خوشحال، ترقی یافتہ پاکستان کا خواب انشاءاللہ نوجوان قیادت جناب چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی بلاول بھٹو زرداری کی شکل میں پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔

آج وطن عزیز ایک مرتبہ پھر تاریخ کی مشکل ترین صورتِ حال سے دوچار ہے۔ پاکستان میں آج سیاسی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی فقدان نظر آ رہا ہے۔ ایک مرتبہ وطن عزیز کے مظلوم، کسان، مزدور، غریب اور دیہاڑی دار طبقہ کی نظریں پاکستان پیپلز پارٹی کے اوپر ہیں۔ انشاء اللہ پاکستان پیپلز پارٹی اپنی تاریخی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے وطن عزیز کے تمام مسائل کو حل کر کے قائداعظم محمد علی جناح قائدعوام شہید ذوالفقار علی بھٹو اور شہید رانی محترمہ بے نظیر بھٹو کا مشن جو ایک خوشحال ترقی یافتہ، آئینی اور جمہوری پاکستان کا تھا انشاءاللہ عوام کی طاقت سے تکمیل تک پہنچا کر دم لیں گے۔

مجھے فخر ہے

مجھے فخر ہے کہ میں پاکستان پیپلز پارٹی کا کارکن ہوں۔ جس نے ہمیشہ اقلیتوں کے حقوق کو عزت دی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ سینٹ میں لعل دین اور کرشنا کماری لوہی کو سینٹرز منتخب کروانے کے بعد پہلی بار عام نشستوں سے تین ہندو ڈاکٹر مہیش کمار ملانی قومی اسمبلی اور دو صوبائی کے ارکان گیان چند اسرانی، ہری رام کشور لال ارکان کو منتخب کروایا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو

سابق وزیر اعظم اور پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن

بے نظیر بھٹو 21 جون 1953ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں ۔ ریڈ کلف کالج اور ہارورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم کے بعد انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے سیاسیات، اقتصادیات اور فلاسفی میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔

بے نظیر بھٹو آکسفورڈ یونیورسٹی یونین کی منتخب ہونے والی پہلی ایشیائی مسلمان خاتون تھیں جو یونین کی صدر منتخب ہوئیں۔ انہیں دنیائے اسلام کی پہلی خاتون وزیر اعظم ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

اپنی جدو جہد میں بھی وہ بے نظیر تھیں اور زندگی کی آخری سانسوں تک ہر ظالم و جابر کے سامنے ڈٹی رہیں۔

بے نظیر بھٹو نے کئی کتابیں بھی لکھیں اور 1988ء اور 1993ء میں دوبار پاکستان کی وزیر اعظم بھی بنیں۔

27 دسمبر 2007ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کی سربراہ اور سابق وزیر اعظم کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں جلسے کے بعد خودکش حملہ اور فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس حملے میں ان کے علاوہ مزید 20 افراد جاں بحق ہوئے تھے۔

نصیر اللہ خان بابر

چیئرمین بھٹو شہید تو حمود الرحمن کمیشن رپورٹ چھاپنا چاہتے تھے جس کے مطابق پاکستان توڑنے میں فوجی جرنیلوں کا ہاتھ تھا تو ایک میٹنگ میں جنرل ٹکا خان نے کہا کہ جناب لوگ ہم سے پہلے ہی ناراض ہیں اگر آپ حمود الرحمن کمیشن رپورٹ چھاپیں گے تو لوگ ہمارے کپڑے پھاڑ دیں

گے۔حالانکہ یہ اپنی پتلونیں تو مشرقی پاکستان میں چھوڑ آئے تھے۔

ایک بہادر جرنیل نصیراللہ خان بابر

ہمیں بھی یاد کر لینا

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئین گلستان میں
ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

تاریخ گواہ ہے کہ فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف جدو جہد میں پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے پاکستان کی جیلیں کبھی خالی نہ رہنے دیں۔کبھی خودسوزیاں اور پھانسیاں ننگی پیٹھوں پر کوڑے طویل المعیاد سزائیں اور ہزاروں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے بدلے محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کو 1988ء میں لولی لنگڑی حکومت قبول کرنا پڑی اسے بھی 18 ماہ بعد چلتا کر دیا گیا۔

Photo 1988 Adyala jail Rawalpindi

آجاؤ

آ جاؤ سن لی میں نے تیرے ڈھول کی ترنگ
آ جاؤ کہ مست ہو گئی میرے لہو کی تال
آ جاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آ جاؤ میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آ جاؤ میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال

فیض احمد فیضؔ

بھول بھی کیسے سکتے ہیں

وہ تمام دن وہ تمام غم جو گزر گئے
ہمیں یاد ہیں ہمیں یاد ہیں
وہ عجیب لوگ وہ قافلے
جو نہ رک سکے نہ بھٹک سکے
ہمیں یاد ہیں ہمیں یاد ہیں
(بھول بھی کیسے سکتے ہیں)

دہشتگردی کا لیبل

سلام اللہ ٹیپو پاکستان کی جیلوں سے 54 سیاسی قیدیوں کی رہائی کے مطالبے میں کامیابی کے بعد جہاز سے باہر آتے ہوئے۔ ہائی جیکنگ تو کامیاب ہوگئی مگر اس کے بعد جنرل ضیاء الحق پاکستان پیپلز پارٹی کے لیے جس کارکن کو گرفتار کرنا ہوتا دہشت گردی کا لیبل لگا کر گرفتار کر لیتا ہزاروں کارکنان گرفتار کر کے شاہی قلعے اور جیلوں میں منتقل کر دیے گئے۔

طاقت کا سرچشمہ

طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔جس دن انہیں اپنی طاقت کا احساس ہو گیا تو ایسا انقلاب برپا ہو گا۔اس دن وڈیرے جاگیردار سرمایہ دار پیسے کے بل بوتے پر سیاست کرنے والے اسٹیبلشمنٹ اور اس کے گماشتے نام نہاد عوام کی لاتوں سے ایسے اچھالے جائیں گے۔

جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اور زندانوں کی خیر نہیں

فیض احمد فیضؔ

منشور

اسلم گورداس پوری

ملوں کے مالکو، محلوں کے وارثو سن لو
زمین پاک کے خونی سوداگرو سن لو
وزیرو، شاہو، رئیسو، ستمگرو سن لو
سیاسی لیڈرو ملت کے تاجرو سن لو
تمہارے عہدِ سیاست کے زخم خوردہ عوام

تمہاری سطوت و ہیبت کا سر اتاریں گے
تمہارا نشۂ دولت اڑا کے دم لیں گے
تمہاری قوم کی تقدیر کو سنواریں گے

تمہارے محل بھی غربت سے آشنا ہوں گے

تمہارے پاؤں بھی کھیتوں میں چلنا سیکھیں گے
تمہارے ہاتھ بھی محنت کے بیج بوئیں گے
تمام لوگ برابر حقوق رکھیں گے

وہ کوہ نور ہو بیکو ہو یا گندھارا ہو
یہ دس کروڑ کا حصہ ہے ایک دو کا نہیں
ٹرانسپورٹ ہو ریلیں ہوں یا ہوائی جہاز
یہ ساری قوم کا حصہ ہے چار سو کا نہیں

یہ سینما ہال یہ بنگلے یہ خوشنما ہوٹل
بتاؤ کن کی بدولت یہ جگمگاتے ہیں

تم ان کے خون کو ارزاں خیال کرتے ہو
کہ جن کے خوں سے تمہاری حیات روشن ہے
کہ جن کے ہاتھ سے دن بھر مشینیں چلتی ہیں
کہ جن کے ہاتھ سے سیاہ فارم رات روشن ہے
زمیندارو وڈیرو تمہاری جاگیریں
غریب و محنتی دہقاں کو بانٹی جائیں گی
بلند و پست کے جھگڑے کو ختم کر دیں گے
خدا نے چاہا تو وہ ساعتیں بھی آئیں گی

بہار سارے چمن کو گلوں سے بھر دے گی
ہر ایک گھر میں چراغوں کی روشنی ہو گی
ہر ایک شخص کو روٹی ملے گی عزت کی
ہر ایک فرد کی خوشحال زندگی ہو گی

ابھی تو بحرِ ستم ہم کو پار کرنا ہے
ابھی خزاں کو بدل کر بہار کرنا ہے
ابھی تو ہم پہ ستم کے ہزار پہرے ہیں
ابھی تو دامنِ شب تار تار کرنا ہے

ہمارے عہد مساوات کے تصور میں
جلال افسر شاہی کا کچھ وقار نہیں
ہمارے دور اخوت میں سب برابر ہیں

کوئی غلام نہیں کوئی تاجدار نہیں

الوداع بابا

کل مریم نواز نے کہا
کہ ڈرتے ہیں بندقوں والے ایک نہتی لڑکی سے
اس کے جواب میں نورالہدا شاہ نے ایک تلخ حقیقت بیان کردی
ایک نہتی لڑکی
راولپنڈی جیل

4اپریل1979ء
صبح سے پہلے
میرے والد کو قتل کر دیا گیا
ویران بدودار سہالہ پولیس کیمپ میں
میں اور ماں مقید
وہ کربناک رات گزارنے کے لیے مجھے ماں نے نیند کی گولی دی تھی
اچانک
میں بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی
نہیں پاپا نہیں
میری چیخ نکل گئی
ایک نہتی لڑکی
میں نے جیلر کو کہا
ہمیں وزیراعظم کے ساتھ جانا ہے
اس نے کہا، وہ انہیں دفنانے کے لیے لے جا چکے ہیں
گھر والوں کے بغیر انہیں دفنانے لے گئے میں نے تلخی سے پوچھا
کہاں لے گئے ہیں؟
وہ چپ
میں ششدر کھڑی رہی
ذوالفقار علی بھٹو جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوئے تھے
موت کی نیند سلا دیے گئے تھے
ایک نہتی لڑکی
میں جیلر کے سامنے بے بس کھڑی تھی
میرے ہاتھوں میں میرے والد کے آخری کپڑے تھے جن سے ابھی تک پرفیوم کی خوشبو آ رہی تھی

میں نے قمیض کو اپنے ساتھ بینچ لیا
مجھے کیتھی کینڈی یاد آ گئی
جس نے اپنے باپ کے قتل کے بعد اس کا لباس پہن لیا تھا
میں بھی کئی راتیں بابا کی قمیض تکیے کے نیچے رکھ کے سوتی رہی
ایک نہتی کڑکی
ضیاء الحق میرے والد کا اطاعت گزار چیف آف آرمی سٹاف جس نے نصف شب طاقت کے ذریعے قبضہ کیا
اور اگلے نو سال پاکستان پر سنگدلی سے حکومت کی
میری زندگی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی
دو برس تک میں نے فوجی حکومت کی طرف سے میرے والد کے خلاف جھوٹے من گھڑت الزامات کے دفاع کے سوا کچھ نہ کیا
ایک نہتی لڑکی
پاپا سے ملاقات تیس منٹ کی تھی
سلاخوں کے پیچھے سے انہوں نے مجھے اور ممی کو کہا:
تم نے بہت تکلیف اٹھائی ہے
وہ آج مجھے قتل کرنے جا رہے ہیں
تم چاہو تو پاکستان سے چلی جاؤ
میری اجازت ہے
ممی نے کہا، ہم نہیں جائیں گے
ہم جرنیلوں کو یہ تاثر نہیں دیں گے کہ وہ جیت چکے ہیں
ایک نہتی لڑکی
پھر سپرنٹنڈنٹ پکارا
وقت ختم ہو گیا
میں نے سلاخیں پکڑ لیں، پلیز کوٹھری کا دروازہ کھولو

مجھے پاپا کو الوداع کہنا ہے
وہ انکار کر دیتا ہے
میں نے التجا کی، میں ان کی بیٹی ہوں، ہماری آخری ملاقات ہے
پھر انکار
پاپا مسکرائے
''خلق خدا میرے گیت گائے گی''
الوداع پاپا

میں نے
پکار کر کہا
قید کے
دوران
میں
6بار ممی
8بار قید
ہوئے
ہم نے

قید سے
حکام کو والد
کی قبر پر
حاضری
کی درخواست دی تھی
7 اپریل کو ہمیں جلدی جلدی ائیر پورٹ لایا گیا
ممی جونہی کار سے نکلیں
سامنے کھڑے فوجیوں نے بے اختیار سلیوٹ کیا، اس شخص کی بیوہ کے آنر میں جس نے

بھارتی قید سے 90 ہزار فوجی آزاد کروائے تھے

مریم نواز

ایک نہتی لڑکی

والد کی قبر پر لے جاتی پرواز میں موجود فوجیوں نے سینڈوچ کافی پیش کی

ان کے چہرے افسردہ تھے

چند افراد کا جرم اکثریت کے ضمیر کا بوجھ بن گیا تھا

لاڑکانہ میں

وہ ہمیں لوگوں کی نظروں سے بچا کر

آبائی قبرستان لائے اور کہا ہم قبرستان میں ساتھ رہیں گے آپ پر نگاہ رکھنے کا حکم ہے

ایک نہتی لڑکی

والد کی قبر پر ہمیں تنہا چھوڑنے سے انکار پر ممی پلٹ گئیں تو پھر ہم قبر پر نہیں جاتے

وہ پیچھے ہٹ گئے

ہم قبرستان میں داخل ہو گئے

یہ میرے اجداد کا قبرستان ہے

ہارورڈ جانے سے پہلے پاپا مجھے یہاں لائے اور کہا

تمہاری جڑیں یہاں ہیں۔ یہ مٹی تمہاری ہڈیوں میں ہے تمہیں بھی یہاں دفن ہونا ہے

ڈرتے ہیں بندقوں والے ایک نہتی لڑکی سے

پھیلے ہیں ہمت کے اجالے ایک نہتی لڑکی سے

ڈرے ہوئے ہیں مرے ہوئے ہیں لرزیدہ لرزیدہ ہیں

ملا، تاجر، جنرل، جیالے ایک نہتی لڑکی سے

آزادی کی بات نہ کر لوگوں سے نہ مل یہ کہتے ہیں

سارے، ظالم، دل کے کالے ایک نہتی لڑکی سے

دیکھ کے اس کی صورت کو جالب ساری دنیا ہنستی ہے

بلوانوں کے پڑے ہیں پالے ایک نہتی لڑکی سے

نایاب وڈیو

گلوکار شوکت علی کی ایک نایاب وڈیو جس میں انہوں چیئرمین بھٹو شہید کی پھانسی پر لکھی ایک نظم سنائی اور محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی شادی پر دل سے لکھا سہرا سنایا چیئرمین بھٹو فن اور فنکاروں کے بڑے قدردان تھے۔ وہ جب بھی بیرون ملک دوروں پر جاتے لوک فنکاروں اور ثقافتی طائفے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ اس روایت کو محترمہ بے نظیر بھٹو شہید اور حتی کہ بلاول بھٹو زرداری نے جاری رکھا۔ پچھلے ادوار میں باقاعدہ ثقافتی شوز کروائے گئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو شہید خود بھی مہمان ہوتیں بلاول بھٹو زرداری تو چند سال پہلے فنکاروں کے ساتھ پروگرام ہوسٹ کرتے رہے۔

My leader Mir Murtaza Bhutto Shaheed 1996 with Dehri Hassaan abad Rawalpindi

میر مرتضی بھٹو شہید کے ساتھ میری آخری یادگار تصویر جب وہ ڈھیری حسن آباد راولپنڈی پاکستان پیپلز پارٹی کے بہادر کارکن ضیاء الحق کے مارشل لاء میں پھانسی کی سزا پانے والے میرے بچپن کے دوست ادریس بیگ شہید کی تعزیت کے لیے آئے تھے۔

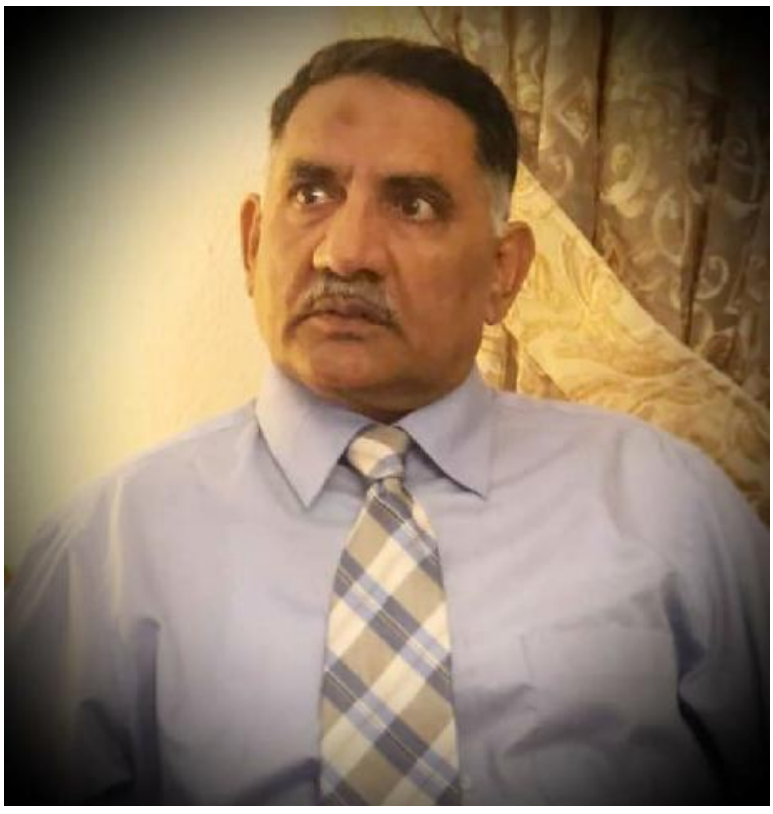

انقلابی شاعری

ہاں جاں کے زیاں کی بھی ہم کو تشویش ہے لیکن کیا کیجیے
ہر راہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

فیض احمد فیضؔ کی شاعری پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیض نے ساری انقلابی شاعری بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی جدوجہد پر لکھی ہو۔

میرا قائد میر مرتضیٰ بھٹو

تو قیدی ہے پرچھائیں کا

تو قیدی ہے پرچھائیں کا
میں عاشق بھٹو سائیں کا
میں مرنے کو تیار
اک تیر ہے اک تلوار

رحمت اللہ انجم

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

یوم شہادت 14 ستمبر 1983ء

رحمت اللہ انجم شہید (بفہ ہزارہ)

شہید ابن شہید علی محمد ہنگورو

لیاری کی تنگ وتاریک گلیوں میں جنم لینے والا علی محمد ہنگورو بالمعروف ''علی ہنگورو''، نسل در نسل باوقار جدوجہد سے جام شہادت تک ثابت قدم، شہید علی ہنگورو کے والد شہید یعقوب ایک مزدور لیڈر تھے۔

وہ مچھی میانی میں مزدور کاز کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان کی بازی ہار گئے۔ باپ کی شہادت نے کم سن علی ہنگورو پر گہرے نقش چھوڑے غربت پروری اور وفاداری والد سے حصے میں ملی

شہید علی محمد ہنگورو کی زندگی مزدوری سے سندھ اسمبلی نشست تک ان تھک جدوجہد سے پُر ہے اپنی جدوجہد کا آغاز پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور بعدازاں سندھ پیپلز یوتھ سے کیا، وہ جدوجہد پر یقین رکھتا تھا۔

اپنی اسی روشن خیالی کی بدولت سازشوں، بہروپیوں اور بھٹو دشمن عناصر قوتوں کو کھٹکتا تھا، اس نے اپنے وقت کے آمر جام صادق کو للکارا اور اسمبلی کے فلور پر نعرہ حق بلند کیا۔

یا الٰہی کسی کم ظرف کو طاقت نہ ملے
کسی ظالم کو زمانے کی قیادت نہ ملے
فکر منفی کو کبھی علم و فراست نہ ملے

اور جب سازشیں حد سے بڑھیں زرداروں کا عمل دخل اور غریب ورکروں کے ساتھ زیادتیاں بڑھنے لگیں علی سید مظفر حسین شاہ کے دور میں آزاد سیٹ پر بیٹھ کر اپنی جدوجہد جاری رکھی

1993ء میں جب میر مرتضی بھٹو کے وطن واپسی پر اعلان کے ساتھ علی شہید نے شہید بھٹو کمیٹی بنا کر میر مرتضی بھٹو کا استقبال کیا پھر نہ رات دیکھی نہ دن لیاری کا یہ کمانڈر استقبال تیاریوں میں مصروف ہو گیا وہ تاریخ ساز دن آج بھی لوگوں کو یاد ہے جب میری مرتضی بھٹو اپنی ہی بہن کے دور اقتدار میں شیخ زاہد کے طیارے سے اترنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

جہاں اس کے باوقار استقبال کے لیے عوام کا سمندر منتظر تھا۔جس کی قیادت بیگم نصرت بھٹو اور شہید علی محمد ہنگورو کر رہے تھے۔علی ہنگورو کا یہ جرم نا قابل معافی تھا رات گئے کراچی ائیر پورٹ پر میر مرتضی بھٹو کو ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔

گلی کوچوں میں عوامی احتجاج شروع ہو گئے تھے۔یہاں سے بھٹو کے نام پر ووٹ لینے

والے بھٹو کے چاہنے والوں پر تشدد اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا محترمہ بیگم نصرت بھٹو کی قیادت میں اپنے قائد سے ملاقات کے منتظر علی محمد ہنگورو کو گرفتار کیا گیا۔

وہ باوقار لیڈر اور مرتضی بھٹو کا سچا سپاہی علی محمد ہنگورو جرم وفاداری میں پابند سلاسل ہوا جو چل کر تو گیا لیکن واپسی آغا خان کے اسٹریچر پر لاش کی صورت میں ہوئی۔

شہید ابن شہید علی محمد ہنگورو کی انقلابی جدوجہد پر لال سلام

مسعود احمد بھائی

سپاف (شہید بھٹو) ضلع جامشورو

20 ستمبر 1996ء

ہم مرے نہیں بلکہ مارے گئے تھے
بس ہو سکے تو اتنا یاد رکھنا
ریاستی پولیس کے پیشہ ور قاتلوں کے ہاتھوں قتل کیے گئے سانحہ 70 کلفٹن کے غیور شہداء
کو خراج تحسین
مقتل شہر میں ٹھہرے رہے ہجرت نہیں کی
وہ جانتا تھا کہ درندے اس کی گھات میں
ملک کے کونے کونے میں تاک لگائے بیٹھے تھے
مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بھٹو ہے

پلٹ جانا یا سر تسلیم خم کرنا
جس کے لیے سب سے بڑا طعنہ تھا
وہ امید تھا، آس تھا
وہ بہادری و دلیری کی عکاس تھا
وہ خوبصورت خواب تھا
عوام میں بے شمار مقبولیت کی وجہ سے
اس کے کئی نام تھے
قائد انقلاب، انقلابی، ایشین چی گویرا، بہادر، دلیر، شیر باغی شہزاد، میر صاحب، میر بابا،
عوامی جرنیل، حریت پسند
شہید میر مرتضی بھٹو
شہید عاشق حسین جتوئی
شہید سجاد حیدر گاکھڑو
شہید یار محمد بلوچ
شہید رحیم بروھی
شہید وجاہت جوکھیو
شہید ستار راجپر

کالی رات

20 ستمبر 1996ء کی کالی رات (آخری حصہ)

ہمارے گھر (70 کلفٹن) کے باہر ہونے والی شدید فائرنگ 45 منٹس کے بعد رک چکی تھی۔ میرے پاپا (میر مرتضیٰ بھٹو) کی اب تک کوئی خبر نہیں تھی۔ میں اپنی امی (غنویٰ بھٹو) کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے باہر آئی اور پولیس والوں سے فائرنگ کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ کچھ ڈاکوؤں سے ہمارا مقابلہ ہوا ہے۔ باہر خطرہ ہے اس لیے آپ اندر رہیں پولیس والوں پہ یقین کر کے ہم واپس گھر آئے۔

کچھ دیر بعد مجھے پتہ چلا کہ باہر ہونے والی فائرنگ کسی اور پہ نہیں بلکہ میرے پاپا اور ان کے ساتھیوں پہ ہوئی ہے۔ فائرنگ بند ہونے کے بعد 40 سے 50 منٹس تک میرے پاپا اور ان

کے ساتھیوں کو جائے وقوعہ پر ہی تڑپتا چھوڑ دیا گیا۔جس کا مقصد صرف یہی تھا کہ خون زیادہ بہنے کی وجہ سے تمام زخمی جن میں پاپا بھی شامل تھے اپنے آپ مر گئے۔

اس پولیس کارروائی کا مقصد صرف ایک ہی تھا میرے پاپا کو قتل کرنا۔یہ ایک منظم اور طے شدہ منصوبہ تھا۔جس کی تیاری پولیس والوں کی جانب سے سے پچھلے کئی دنوں سے جاری تھی۔

فائرنگ کے بعد پاپا کے کافی ساتھی موقع پر ہی شہید ہو گئے لیکن پاپا زخمی اور زندہ تھے۔اگر پاپا کو جلدی سے طبی سہولیات ملتی تو وہ بچ سکتے تھے لیکن پولیس کو پاپا کے قتل کے احکامات ملے ہوئے تھے تو وہ کیوں پاپا کو طبی سہولیات دلواتے۔فائرنگ بند ہونے کے تقریباً 50 منٹس بعد پاپا کو

پولیس کی گاڑی میں رکھا گیا اور اسی گاڑی میں پاپا کو انتہائی نزدیک سے چہرے پر گولی ماری گئی اور یہی گولی میرے بابا کی موت کی وجہ بنی۔اس کے بعد آپ کو (مڈایسٹ) ہسپتال منتقل کیا گیا یہ ایک ایسا ہسپتال تھا جس میں ایمرجنسی اور آپریشنز وغیرہ کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔

جب مجھے پاپا کے زخمی ہونے کا پتہ چلا تو میں نے وڈی آنٹی بے نظیر بھٹو کو (میں سندھی میں

وڈی کہہ کر بلاتی تھی) جو اسلام آباد میں موجود تھیں، کو فون کیا۔ میرا فون وڈی کے کسی پی۔اے نے اٹھایا تو میں نے کہا وڈی سے میری بات کروائیں تو اس نے کہا وزیر اعظم صاحبہ سے آپ کی بات نہیں ہوسکتی۔ آپ آصف زرداری سے بات کریں جس سے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زرداری نے فون اٹھایا تو میں نے کہا مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔ وڈی سے میری بات کروائیں۔ میرا لہجہ سن کر زرداری نے کہا اس واقعے کا لزام آپ مجھ پہ دھر رہی ہیں تو میں نے کہا میں نے الزام لگانے کے لیے فون نہیں کیا اور نہ ہی آپ سے بات کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ مجھے وڈی سے بات کرنی ہے۔ جواب میں زرداری نے کہا آپ کی ان سے بات نہیں ہوسکتی اور فون بند کر دیا ۔ وڈی سے رابطہ نہ ہونے کے بعد میں امی کے ساتھ ہسپتال پہنچی اور اپنے پاپا کو دیکھا۔ جن کی نیوی بلیو

قمیض شلوار خون سے بھر چکی تھی، میں نے پاپا کے چہرے کو ہاتھ لگایا اور ان کے چہرے کو چوما پیار کیا اور ڈاکٹرز کے آنے کا انتظار کیا۔ ڈاکٹرز ہمارے آنے کے بھی بعد میں پہنچے تھے وہاں۔ پاپا کے چہرے سے جب میں نے اپنا ہاتھ ہٹایا تو میرا ہاتھ پاپا کے خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ میری امی (غنویٰ بھٹو) پاپا کے قریب بیٹھ گئیں اور زور زور سے چلاتے ہوئے پاپا سے کہا پلیز ہمیں چھوڑ کر مت جائیں۔ فاطمہ اور زلفی کو آپ کی بہت ضرورت ہے اپنے معصوم بچوں کو چھوڑ کر مت جائیں۔ میری نظریں (heart beat monitor) پہ تھیں اور جب ہمارا نام لے رہی تھیں تو پاپا کے دل دھڑکن تیز ہو جاتی تھیں جیسے وہ میرا اور زلفی کا نام سن کے جواب دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

میرے زخمی پاپا موت سے لڑتے رہے لیکن میرے پیارے پاپا بچ نہ سکے اور آدھی رات کو

ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔

شہادتوں کے علم

شہادتوں کے علم جب بلند ہو جائیں
تو پھر جہان میں رسوا یزید ہوتے ہیں

عظیم باپ کی بیٹی بتا گئی شوکت
حسینؑ والے ہمیشہ شہید ہوتے ہیں

وطن کے ہر غریب کو جگا کے آپ سو گئی
شعور جب طلوع ہوا تو خود غروب ہو گئی

غریب قوم کے لیے وہ باپ کی سفیر تھی
نظیر جس کی نہ ملے وہ اتنی بے نظیر تھی

وفاق کی امنگ تھی عوام ہی کے سنگ تھی
کنیز کربلا کی بس یزیدیت سے جنگ تھی

بہا کے لے گئی ہر ستم کو اپنی موج سے

وہ کربلائے وقت میں ڈری نہیں ہے فوج سے
وہ آمروں کی گردنوں پہ نقش پا جما گئی
وہ بھٹو بھٹو کر کے سب کو بھٹو ہی بنا گئی

سنو لحد کی گود میں وہ صاحب مراد ہے
وہ کل بھی زندہ باد تھی وہ اب بھی زندہ باد ہے

سلام شہید رانی

احمد سعید اعوان

لائلپور/فیصل آباد کی سب سے قد آور شخصیت جن کی خطابت ،عوام دوستی،ایمان داری ، سیاسی فہم وفراست،قائدانہ تدبر انھیں ماضی،حال اور مستقبل میں فیصل آباد کے سب سے معتبر وممتاز سیاست دان کے مقام پر فائز رکھیں گے۔انہوں سیاسی کارکن کی حیثیت سے پی پی پی کے قیام کے فوری بعد بھکر اور بعد ازاں لائلپور میں جس جدو جہد کا آغاز کیا تھا وہ وزارت اور ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کے اہم عہدوں کی ذمہ داری کے ملنے تک ایک تسلسل سے جاری رہی ۔ 1977 میں شہید بھٹو کی گرفتاری کے بعد جنرل ضیاء الحق نے اکتوبر میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا تو انتخابی میم کی قیادت کا فریضہ بیگم نصرت بھٹو نے انجام دیا وہ شہر شہر جلسے کر رہی تھیں ۔ فیصل آباد کے جلسے کے لیے ملک احمد سعید اعوان کی تجویز پر شہید محترمہ بے نظیر بھٹو کو عملی سیاست کے آغاز کے لیے فیصل آباد مدعو کیا گیا۔اس طرح شہید بی بی نے اپنے سیاسی کیریئر کے سب سے پہلے تاریخ ساز جلسہ سے خطاب کیا جس کا کریڈت اعوان صاحب کو جاتا ہے۔ضیاء دور میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں کے ساتھ کوڑوں کی سزا کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کی استقامت اور پارٹی سے وفاداری

میں کمی نہ آئی۔ایم آر ڈی کی احتجاجی تحریک کو فیصل آباد ڈویژن میں منظم کرنے کے لیے بھی انہی کا کلیدی کردار تھا۔اس ضمن میں 1985ء میں ایم آر ڈی کا ایک بہت بڑا جلسہ کروانے میں ان کی شب و روز کی محنت شامل تھی۔13 اپریل 1986ء میں لاہور کے بعد سب سے بڑا جلسہ فیصل آباد میں ہوا تھا شہید بے نظیر بھٹو نے اس جلسہ کے کامیاب انعقاد پر ملک صاحب کی حد درجہ پذیرائی کی تھی۔شہید بی بی ملک صاحب کو بہت عزت و احترام کا مقام دیا کرتی تھیں۔فنِ خطابت میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔گھنٹوں عوامی جلسوں سے خطاب کرتے مگر جلسہ گاہ میں حاضرین جم کر انہیں سنتے رہتے۔ان کی نظریاتی وابستگی کا کمال یہ تھا کہ لیفٹ کے لوگ انہیں سرخا اور رائٹ کے اسلامسٹ قرار دیتے۔ایک جلسہ میں میرے ممدوح نے دو گھنٹہ کا طویل خطاب سوشلزم کی حمایت میں کیا تھا جس سے لائلپور کے شہریوں نے سرخوں کے بارے میں اپنی رائے کو بدلنا شروع کر دیا تھا۔1988ء میں انہیں وزیر مملکت اطلاعات کا قلمدان سونپا گیا جبکہ 1994 میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس بھی مقرر ہوئے دونوں

عہدوں پران کی کارکردگی مثالی رہی تھی۔سیاسی وسماجی زندگی میں دوست کے طور پران کی وفاداری ایک مثال کا درجہ رکھتی تھی۔ جسے ایک بار دوست بنا لیتے اس سے ہر ممکن حد تک وفا کرتے۔وہ اپنی خانگی زندگی میں بھی عظمت کے مینار رہے اور سماجی شب و روز میں بھی خلق خدا کے لیے ہمیشہ خیر کا سبب بنے رہے۔ملک احمد سعید اعوان فیصل آباد کے مقبول ترین سیاست دان رہے۔گلی محلہ کی سطح پر ایک ایک پارٹی کارکن کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ان کے ہر دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔وہ ممبر پنجاب اسمبلی وقومی اسمبلی منتخب ہوئے اور بطور وزیر مملکت بھی فرائض انجام دیے۔ایک پیشہ ور وکیل کے طور پر انہوں نے انکم ٹیکس کے ہزاروں مقدمات میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ۔2015ءکو اپریل کے پہلے ہفتے میں مختصر بیماری کے بعد وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور فیصل آباد کی گلیوں کو چوں کو اداس کر گئے۔نوٹ: ملک احمد سعید اعوان کی تصویر جس میں مرحوم خطاب کر

رہے ہیں۔ان کے ہمراہ زوار حسین کامریڈ، غلام عباس انقلابی اسٹیج پر موجود ہیں۔بلیک اینڈ وائٹ تصویر 1990ءکی ہے جس میں مرحوم کے گھر میں شہید بھٹو کی سالگرہ کا کیک کاٹا جا رہا ہے ان کے

ہمراہ رانا صادق خاں مرحوم، ریاض شاہد مرحوم، چوہدری سلمان طاہر مرحوم، چوہدری محمد حسین، رانا خاور جاوید، غلام عباس انقلابی اور زوار حسین کا مریڈ ہیں۔

عارف خان

پاکستان پیپلز پارٹی کے سنیئر رہنما اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والا، شاہی قلعہ کا قیدی، ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا عارف خان کی 64 ویں سالگرہ کی تقریب سبزہ زار میں ہوئی۔

عوامی ہیرو عبدالرشید عاجز

زوار حسین کامریڈ

شہید بھٹو کے عدالتی قتل کے خلاف خودسوزی کرنے والے عوامی ہیرو ،سپوت لائلپور عبدالرشید عاجز کی ناقابل مصالحت جدوجہد کی کہانی ۔عبدالرشید عاجز محنت کشوں کے شہر لائلپور /فیصل آباد میں پاکستان پیپلز پارٹی کے جیالے کارکن تھے۔ان کی رہائش محلہ پنج پیر میں تھی۔شہید بھٹو کی عوامی حکومت میں وہ ہمہ وقت اپنے علاقے کے مسائل زدہ مکینوں کے مصائب کے خاتمے میں کوشاں رہتے تھے ۔ضیاء مارشل لاء کے خلاف پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی جرات مندانہ اور ناقابل مصالحت جدوجہد میں بھی ان کا کردار بہت نمایاں ہے۔شہید بھٹو کے عدالتی قتل کا فیصلہ سنائے جانے کے بعد قائدعوام کی رہائی کے لیے ملک گیر تحریک کے ثمرات جب توقع کے برعکس ہوئے تو احتجاج کو تیز کرنے اور عالمی میڈیا کی توجہ حاصل کرنے کے لیے یکم اکتوبر 1978ء کو لاہور کے لکشمی چوک میں عبدالرشید عاجز نے اپنے آپ کو نذر آتش کر کے خودسوزی کر لی تھی۔دنیا بھر کی سیاسی تاریخ میں کسی بھی سیاست دان کے لیے جان نثار کرنے کا یہ اولین واقعہ تھا۔زیر نظر تصویر شہید جمہوریت کی آخری آرام گاہ واقع قبرستان ببر سائیں جھنگ روڈ کی ہے۔یہاں پارٹی کارکنان سابق صوبائی وزیر و سینئر پارٹی رہنما بدرالدین چوہدری اور مزدور رہنما حاجی طفیل محمد مرحوم ،پارٹی کے سابق مرکزی رہنما قیوم نظامی ،آغا ندیم ،شیخ شاہد ،ادریس بٹ ،جاوید چوہدری ،مہر عبدالرشید اور شوکت خوانی کر رہے عبدالرشید عا پیپلز پارٹی و

آف محلہ پنج پیر قصائی فاتحہ ہیں ۔افسوس جز اور پاکستان دیگر سیاسی

جماعتوں کے ہزاروں کارکنوں وقائدین جن میں بھٹو سب سے نمایاں ہیں، کی قربانی بھی پاکستان میں طاقت کا سرچشمہ عوام کو بنوانے میں تاحال کامیاب نہیں ہوسکیں۔

کہاں قاتل بدلتے ہیں فقط چہرے بدلتے ہیں
عجیب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں
وہ جس کی روشنی کچے گھروں کو جگمگائے گی
نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ دن اپنے بدلتے ہیں

حبیب جالبؔ

بی بی بے نظیر کی شہادت پر

ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے
جتنے غزال تھے میرے دشت میں مار دیے گئے

یوں تو سب اہل فکر کا قبلہ و کعبہ ایک تھا
پھر وہ سب کے سب یہاں کافر قرار دیے گئے

ہم سے کچھ ایسے جینے کی قیمت وصول کی گئی
جیسے کہ زندگی کے دن ہم کو ادھار دیے گئے

سب کو ہی اس کا علم تھا درد یہ لا علاج ہے
جھوٹی تسلیاں ہمیں سارے ہی یار دیے گئے

دار و رسن کی موت تو عز و شرف کی موت ہے
ہم تو وفا کے نام پر مفت میں وار دیے گئے

اہل خرد کی گتھیاں ہم سے سلجھ نہ پا سکیں
اہل جنوں کے جو بھی تھے کام سنوار دیے گئے

بس ہمیں زندگی میں ایک بادہ کشی کا شوق تھا
ہم کو اس اپنے شوق کے طعنے ہزار دیے گئے

یہ تو بجا ہے زندگی ہم کو عطا ہوئی مگر
کتنے ہی ساتھ رنج و غم مرحلہ وار دیے گئے

اسلم کمال علم و فن سوزِ دروں کی بات ہے
ہم کو خیال و فکر میں سارے شرار دیے گئے
اسلم گورداسپوری

وقت کی پکار بے نظیر بار بار

تحریر: ابرار میر، لندن

جب 18 اکتوبر 2007ء کو پیپلز پرٹی کے کارواں پر کارساز میں حملہ ہوا تو ٹارگٹ نہ صرف محترمہ شہید بے نظیر بھٹو تھیں بلکہ ٹرکوں گاڑیوں میں موجود پیپلز پارٹی کی صف اول اور صف دوم کی ساری قیادت بھی تھی۔ وہ ہولناک قیامت خیز منظر دیکھے نہیں جا سکتے تھے۔ لیکن انسان کا تعصب، بغض اور نفرت شاید اس لیے اسے شیطانیت سے بھی زیادہ مکروہ کر دیتا ہے۔ برطانیہ میں بیٹھ کر ہم نے ایسے تاثرات بھی سنے کہ کہا گیا ''یہ حملہ بے نظیر نے خود کروایا تا کہ سستی شہرت حاصل کی جا سکے۔'' وہ لاڑکانہ کے دیہات والی لڑکی لال قلندر اور پنڈی کے سکول میں پڑھنے والی اپنے آپ کو شہری بھی کہتی اور دیہاتی بھی مانتی تھی۔ اس لیے وہ کسان مزدور، غریب اور شخص کی درد شناس اور ہمراز بھی تھی اس کی للکار خوشی اور کرب کی ایسی آمیزش تھی کہ جسے وہی سمجھ سکتی تھی۔

وہ بچپن سے لڑکپن تک شاہی زندگی گزار رہی تھی مگر جوانی میں ظلم وستم کے پہاڑ اس کے منتظر تھے اور آغاز شہید ذوالفقار علی بھٹو کی عدالتی قتل کے فیصلے والی پھانسی سے ہوا۔ پھر ایک نہ رکنے والی کربلا شروع ہوگئی اور اس کا جواں سال بھائی شاہنواز بھٹو سن پچاسی میں ان سے چھین لیا گیا۔ وہ اس قیامت کو برداشت کرتے ہوئے پھر کھڑی ہوئیں اور ملک بدری کے بعد دس اپریل چھیاسی کو پاکستان واپس آئیں۔ لاہور میں جیسے سارا پاکستان ہی ان کے استقبال کو آ پہنچا ہو اور منٹوں کا سفر گھنٹوں میں ہوا کہ جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب ''مشرق کی بیٹی'' میں بھی کیا۔ سن ستاسی میں شادی ہوئی اور اللہ نے اگلے ہی سال ایک چاند سے بیٹے ''بلاول'' سے نواز دیا۔ اسی سال مسلم امہ کی سب سے پہلی خاتون وزیر اعظم بننے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ ان کی دو حکومتوں کو ایسے ختم کیا گیا

گویا نا قابل برداشت تھیں ۔حدتو یہ ہوئی کہ کسی حدتک تھمی ہوئی کربلا نے ان کے دوسرے دور حکومت میں پھر سر اٹھا لیا اور سن چھیانوے میں ان کا ایک اور جوان بھائی میر مرتضی بھٹو دن دیہاڑے شہید کر دیا گیا۔اس صدمے نے پہلے سے چوٹ کھائی ماں کو مکمل طور پر دماغی طور پر کمزور کر دیا۔

یہ لڑکی لال قلندر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اپنے شوہر آصف علی زرداری کے لیے جیلوں میں چکر لگاتی رہی اسی دوران ایک بار پھر آٹھ سال کے لیے ملک بدری کا سامنا کرنا پڑا۔مگر جب پاکستان میں ایک بار پھر آمریت اپنے عروج پر تھی اور آمر رعونیت کے نشے میں بنیادی انسانی حقوق سمیت آئین کو روندتا چلا جا رہا تھا تو اس وقت اس لڑکی لال قلندر نے آمر کو للکارا اور موت کی بھی پرواہ نہیں کی اور پاکستان واپسی کا اعلان کر دیا۔دنیا نے کہا بھی کہ بی بی آپ مت جاؤ وہاں آپ کو مار دیں گے تو دلیر باپ کی بہادر بیٹی نے جواب دیا کہ ''میں باہر کسی ملک میں ایکسیڈنٹ میں مرنے سے بہتر اپنے ملک میں اپنے عوام کے لیے مرنے کو ترجیح دوں گی'' دوبئ میں اپنے بچوں اور شوہر نے وداع کیا اور وہ ایک ایسا دل خراش منظر ہوگا کہ جب ایک ماں کو پتہ بھی تھا کہ وہ شاید دوبارہ اپنے بچوں کو نہ دیکھ سکے گی وہ پھر بھی نہیں رکی اور مقتل کی طرف روانہ ہوگئی۔ 27 دسمبر 2007ء کو وہ جیسے حور پری لگ رہی تھیں کہ اسی تھمی ہوئی کربلا نے پھر میدان لگایا اور لڑکی لال قلندر نے جام شہادت نوش فرمایا۔ایک طرف ماں ،اپنے بچے ،شوہر اور اکلوتی بہن کے علاوہ رشتہ دار اور پھر پورا پاکستان سکتے میں چلا گیا۔وہ چھلاوا بن کر آنا پھر آناً فاناً جدا ہوگئیں ۔پیپلز پارٹی کا کارکن ایک بے یقینی کی کیفیت میں چلا گیا۔2008ء میں پیپلز پارٹی کو ایک بار پھر پورے اقتدار سے روکا گیا لیکن آج یہ سوال میرے ذہن میں بار بار آتا ہے کہ صرف پانچ سال کے وقفے کے بعد پیپلز پارٹی کا کارکن اور ووٹر کدھر چلا گیا کہ پنجاب میں جہاں کم ازکم پچاس ہزار سے لاکھوں کی تعداد میں ووٹ ملتے تھے وہاں پانچ ہزار سے پندرہ بیس یا پھر تیس چالیس ہزار تک محدود کر دیا گیا لیکن پھر تاریخ کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو امید نظر آتی ہے کہ جب کربلا کی شہادتوں کی داستان دین کو زندہ کر گئی وہیں سیاسی ولی شہید ذوالفقار علی بھٹو اور شہید رانی بے نظیر بھٹو کی قربانی کسی صورت جمہوریت کا سورج غروب نہیں ہونے دی گی۔2011ء میں مادر جمہوریت محترمہ نصرت بھٹو بھی دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں وقت کا دھارا بدلتا رہا اور اسی لڑکی لال قلندر کے لخت جگر بلاول بھٹو نے اپنے نانا

،ماموں اور ماں کے غم کو اپنی طاقت بنایا اور میدان جنگ میں بھٹو کا جھنڈا تھامے مشن کی تکمیل کا عزم کرتے ہوئے للکار رہا ہے۔ابھی بلاول بھٹو آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور وقت کی پکار بے نظیر کی شکل میں آصفہ بھٹو بھی عوام کے لیے آ کھڑی ہوئیں ۔اب دنیا کیسے نہ مانے یہ خاندان اقتدار نہیں بلکہ اپنی اقدار کو زندہ رکھنے کے لیے ملک وقوم کی بہتری اور ترقی کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ یہ وہی خاندان ہے جو سر کٹا دیتا ہے لیکن اپنی قوم کو مایوسی نہیں دیتا ۔آج کا بچہ، بوڑھا، جوان اور مائیں بہنیں یک زبان پکار اٹھیں کہ بے نظیر پھر آ گئی جیسے زندگی آ گئی ۔

میری ہمتیں ابھی جھکی نہیں میرے حوصلے ابھی بلند ہیں
مجھے ہار جیت سے غرض نہیں میری جنگ تھی سو میں لڑ گیا

میجر آفتاب احمد

میجر آفتاب احمد چوہدری اٹک سازش کیس کا ایک بہت بڑا ملزم اگر میں اپنے قریبی دوستوں کی فہرست بناؤں تو جنہیں میں top ten میں شامل کروں تو ان میں ایک نام میجر آفتاب احمد چوہدری کا ہے کھاریاں گجرات سے تعلق بغاوت اگر کامیاب ہو جائے تو انقلاب، اگر ناکام ہو جائے تو سازش۔ پاکستان کا سب سے بڑا سازش کیس کوٹ لکھپت جیل سازش کیس۔اس کے علاوہ میجر آفتاب احمد چوہدری اٹک سازش۔ لیبیا سازش کیس، اور میجر تجمل سازش کیس جنرل ضیاء الحق کے خلاف مزاحمتی تحریک کے نشان ہیں۔میجر نثار بخاری، کرنل شہزاد، میجر صادق اور دیگر جونیئر آفیسر پر مشتمل اس گروپ نے بغاوت کی مگر پکڑے گئے کورٹ مارشل عمر قید کی سزائیں ہوئیں۔اس طرح میجر آفتاب احمد چوہدری اور میجر نثار بخاری میرے دوست بن گئے۔ بلکہ بہت قریب آ گئے

خصوصاً جہلم جیل میں ساتھ رہا مختلف احاطوں میں رہنے کے باوجود ہم دونوں بہت بڑی لمبی لمبی خط و کتابت ہوتی بلکہ لیٹر پیڈ ناکافی ہوتا تھا ہماری باتیں اتنی طویل ہوت تھیں کہ امتحانی پرچوں پر مشتمل 8-10 صفحات پر مشتمل خطوط ہوتے۔جیل سے باہر آئے تو دوستی اس وقت اور بڑھی جب میں خواجہ معین الدین سید، شیخ قیوم لیبر راہنما محمد شفیع انہیں کھاریاں سے زبردستی اسلام آباد لائے کہ

مارشل لاء کے خلاف جدو جہد کرنے والے سیاسی قیدیوں کے مسائل کے حل کے لیے بنائی جانے والی کمیٹی کی قیادت کریں اپنی ہی بے نظیر حکومت کے خلاف سٹیج سجایا وزیر اعظم ہاؤس کے سامنے بھوک ہڑتال کیمپ لگائے بالآخر ہزاروں سابق سیاسی قیدیوں کو اقبال ہال کے تالے توڑ اسیران جمہوریت کنونشن کروایا۔جس میں پاکستان بھر مارشل لاء کے کے سابق قیدی آئے پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کی طرف سے بھرپور مخالفت مگر پھر کارکنان کا جم غفیر دیکھ مطالبات مان لیے گئے اس دوران گرفتاریاں بھی ہوئیں ۔لمبی کہانی ہے ۔پھر کبھی سہی ،میری شادی محبت کی شادی تھی ۔ رکاوٹیں دور کرنے کے لیے میجر آفتاب احمد چوہدری کو کھاریاں سے راولپنڈی لایا سسر صاحب جن کے متعلق خدشہ تھا رشتے کے لیے منانا۔میجر آفتاب احمد چوہدری جو اپنی بیگم کے ہمراہ گئے تھے صرف تین گھنٹے کے مذکرات کے بعد میجر صاحب نے کہا بس ایک اور ملاقات پھر اپنے گھر والوں کو باقاعدہ رشتے کے لیے بھیج دینا۔اس کے بعد میر مرتضی بھٹو کی پاکستان آمد ہوتی ہے ہم پھر میر مرتضی بھٹو کے ساتھی بنتے ہیں اس دوران میجر آفتاب احمد چوہدری کو گرفتار کر کے سکھر جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

آغا محمد ندیم

ہم اپنی جدو جہد کے ساتھی آغا محمد ندیم کو پاکستان پیپلز پارٹی ڈنمارک کا جنرل سیکریٹری منتخب ہونے پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں ۔ پاکستان پیپلز پارٹی آغا برادران کی مقروض ہے ، جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف اس خاندان کی بے مثال جدو جہد کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ۔شاہی قلعہ کے عقوبت خانے ہوں یا پاکستان کی جیلیں یا جلاوطنیاں ہر جگہ یہ ثابت قدمی سے ڈٹے رہے ۔شکریہ چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی ۔اگر پاکستان پیپلز پارٹی کو ایک بار پھر چاروں صوبوں کی زنجیر بنانا ہے تو ایسے بہادر قربانیاں دینے والے جیالوں کو آگے لانا ہوگا ۔

بلاول بھٹو کا پیغام

پی پی پی چیئرمین بلاول بھٹو زرداری کا خیر پور ناتھن شاہ سے تعلق رکھنے والے ایم آر ڈی کے شہداء کی برسی پر پیغام

خیر پور ناتھن شاہ کے بارہ شہید کارکنان کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ تاریخ ان شہیدوں کی قربانی کا ذکر سنہری حروف میں لکھے گی: بلاول بھٹو زرداری

پاکستان میں جمہوریت مفت میں نہیں ملی، پیپلز پارٹی نے اس کی خاطر جانوں کی قربانیاں

دیں: بلاول بھٹو زرداری

پی پی پی قیادت و کارکنان آج بھی جمہوریت کی حفاظت کے لیے سیاسی انتقام کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ بلاول بھٹو زرداری

پارٹی کے شہیدوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ بلاول بھٹو زرداری

شہداء کو خراج عقیدت پیش کرنے کا درست طریقہ ان کے مشن کو آگے بڑھانا ہے۔ بلاول بھٹو زرداری

پیپلز پارٹی اپنے نظریے اور جدوجہد سے ایک سیکنڈ کے لیے بھی غافل نہیں ہوئی۔ بلاول بھٹو زرداری

پاکستانی عوام اب ایک نینوسیکنڈ کے لیے بھی جمہوری نظام کی معطلی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بلاول بھٹو زرداری

ضلع دادو کے قصبے خیر پور ناتھن شاہ میں آمرانہ حکومت نے پیپلز پارٹی کے 12 کارکنوں کو شہید کیا تھا۔ 12 ستمبر 1983ء کو عبدالغنی ابڑو، عبدالعزیز لاکھیر، نظام الدین نائچ، عبدالنبی کھوسو اور اللہ وار یولانگاہ کو شہید کیا گیا تھا۔

شاہنواز کھوسو، حبیب اللہ لغاری، دیدار علی کھوکھر، ضمیر حسین جاگیرانی، اعجاز حسین کھونھارو اور منظور احمد چانڈیو بھی شہدا میں شامل ہیں۔

عبدالرزاق جھرنا

7 مئی جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے سب سے پہلے پھانسی

پانے والے عبدالرزاق جھرنا شہید کی برسی ہے محترمہ بے نظیر بھٹو شہید عبدالرزاق جھرنا کے والدین

اور چھوٹی بہن کے ساتھ تصویر۔ جب کوٹ لکھپت جیل ہمیں ملنے آئیں تو سب سے پہلے انہوں عبدالرزاق جھرنا کی پھانسی کا پوچھا۔ ہمارے ساتھی آصف بٹ نے جب بتایا کہ وہ بہت بہادری سے پاکستان پیپلز پارٹی کے ترانے اور جیوے جیوے بھٹو جیوے کے نعرے لگاتے ہوئے پھانسی گھاٹ گیا تو محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کے بعد کیا کسی نے پھانسی پانے والے یا خودسوزیاں کرنے والوں کے لواحقین کی خبر لی میرا پارٹی قیادت سے ایک سوال؟

تصویر کے لیے عبدالرزاق جھرنا شہید کے بھتیجے جہانگیر بدر کا شکریہ

ہاں ہاں زرداری مجرم ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف اعوان

بندوق والوں کا مجرم؟ فتوے والوں کا مجرم؟

زرداری ان سب کا مجرم ہے جن کا بھٹو مجرم تھا، بے نظیر مجرم تھی، مرتضی مجرم تھا، شاہنواز مجرم تھا، سلمان تاثیر مجرم تھا، شہباز بھٹی مجرم تھا، بشیر بلور مجرم تھا، زرداری کو ہر طرح سے توڑا گیا، گیارہ سال جیل میں رکھ کر، بھیانک جھوٹے مقدمے بنا کر، بدترین تشدد کا نشانہ بنا کر، جیل سے نکال کر وزارت کا حلف اٹھوا کر، بالآخر ایوان صدر میں قید کر کے۔

مگر وہ نہ ٹوٹا، نہ جھکا نہ بکا بلکہ ناکام دشمن اس کی مسکراہٹ تک نہ توڑ سکے۔اس پر طرح طرح کے مقدمے بنائے گئے، مقدمے خود ساختہ، قاضی اپنے مگر کچھ ثابت نہ کر سکے، زرداری کی جوانی چھن گئی مگر سچ کا بول بالا ہوا وہ ڈٹا رہا مگر دشمن ہار ماننے والے کب تھے۔انہوں نے پرکشش الزامات پر مبنی کہانیاں گھڑیں، میڈیا پر بیٹھے افلاطونوں کو حکم دیا کہ دن رات ان کی کہانیوں کا ڈھنڈورا پیٹو، اتنا جھوٹ بولو، بار بار بولو، لاکھوں بار بولو، جھوٹ کو سچ بنا دو، بچے بچے کو یاد کروا دو کہ زرداری برا ہے زرداری چور ہے زرداری کرپٹ ہے۔

مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ زرداری کا مقدمہ تاریخ کی عدالت میں ہے۔تاریخ کی عدالت کسی کی خواہشات کی غلام نہیں ہے۔تاریخ کی عدالت ثبوت مانگتی ہے۔تاریخ کی عدالت سچ کو اجاگر کر کے چھوڑتی ہے۔تاریخ کی عدالت وقت کے فرعون کی طرف سے جھوٹے الزامات کو اٹھا کر باہر پھینک دیتی ہے تاریخ کی عدالت ہر ایک مجرم اور ہر ایک ملزم کو کٹہرے میں کھڑا کر دیتی ہے۔یہاں بڑے بڑوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں، ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں، زبان ساتھ نہیں دیتی، یہاں صرف سچ کھڑا ہو سکتا ہے۔اکیلا سچ ہزاروں جھوٹوں پر بھاری ہوتا ہے۔سچ کٹہرے میں کھڑا ہو کر اور سر اٹھا کر بولتا ہے۔تاریخ کی عدالت پوچھے گی اے الزام لگانے والو! جھوٹے مقدمے بنانے والو، زرداری کی ساری جوانی چھین لینے والو، زرداری کو سالہا سال تک اپنی بیوی اور بچوں سے دور رکھنے والو، زرداری قبیلے کے سردار اور سینکڑوں مربعے زمین کے مالک، نواب شاہ کے رئیس اعظم حاکم علی زرداری کے اکلوتے بیٹے کو کرپشن کی کیا ضرورت تھی؟ تاریخ پوچھے گی کہ کلفٹن کی مہنگی

زمین اور سینماؤں کے مالک ایک کامیاب بزنس مین حاکم علی زرداری کے اکلوتے بیٹے کو کرپشن کی ضرورت ہی کیا تھی؟

تاریخ کی عدالت یہ بھی پوچھے گی کہ کچھ اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم ایک سرکاری ملازم ہوتے ہوئے اربوں کھربوں کے مالک کیسے بن گئے؟ تاریخ یہ بھی پوچھے گی کہ تم لوہا کوٹتے کوٹتے چند سالوں میں کھربوں کی جائیدادوں کے مالک کیسے بن گئے؟ تاریخ یہ بھی پوچھے گی کہ اپنے جرائم چھپانے کے لیے تم دوسروں پر الزام لگاتے رہے، خریدے ہوئے قلموں اور بکی ہوئی زبانوں کے پیچھے چھپ کر وار کرتے رہے؟

یہ تاریخ کی عدالت ہے جو سچ کو جھوٹ سے الگ کر دیتی ہے۔ سچا ہیرو اور جھوٹا زیرو قرار دیا جاتا ہے۔ اگر تاریخ کی عدالت نہ ہوتی تو نمرود کے مقابلے میں ابراہیمؑ فرعون کے مقابلے میں موسیٰؑ، یزید کے مقابلے حضرت حسینؓ ہیرو کیسے قرار پاتے۔ کافر قرار دیے جانے والے بھلے شاہ کو ولی اللہ کون مانتا۔ رات کے اندھیرے میں قتل کر کے دفن کر دیے جانے والے بھٹو کو شہید کون کہتا اور تاریخ کی عدالت نہ ہوتی تو شاہی تزک و احتشام کے ساتھ دفن کیے جانے والے جنرل ضیاء الحق کی قبر پر یوں ویرانی نہ چھائی ہوتی۔ تاریخ کی عدالت نہ ہوتی تو بے نظیر کو شہید رانی کا خطاب کون دیتا اور اس کے سڑک پر پھیلے خون کو رات کے اندھیرے میں قاتل ٹولہ پانی سے دھو دھو کر قتل کے ثبوت مٹانے کے باوجود در در بھاگتا نہ پھر رہا ہوتا۔

زرداری کو تاریخ کی عدالت بتدریج ہیرو بنا رہی ہے۔ ابھی سماعت جاری ہے، جھوٹے مقدمات پر دھمالیں ڈھالنے والوں سے تاریخ کے قاضی نے ابھی کئی سوال پوچھنے ہیں، چمکتے چہروں کے نیچے بھیانک جرائم کی سیاہی کو بے نقاب کرنا ہے۔ دلیل کا جواب گالی اور الزام سے دینے کے بجائے دلیل سے دینا سیکھ لیں۔ یہی مہذب ہونے کا تقاضا ہے۔

فتح دلیل کی ہی ہوتی ہے۔ پروپیگنڈہ اور طاقت کا رعب و داب تاریخ کے کوڑے دان میں

ہمیشہ کے لیے غرق ہو جاتا ہے۔ زرداری کی مسکراہٹ کا یہی راز ہے کہ وہ اپنے حریفوں کی بے بسی پر مسکرا رہے ہیں۔ وہ انہیں اپنے نور بصیرت سے تاریخ کے گڑھے میں گرتا دیکھ رہے ہیں۔

چشم کُشا انٹرویو

پاکستان پیپلز پارٹی کن حالات و مقاصد کے لیے قائم ہوئی، پارٹی سے قبل لاہور کی کن شخصیات سے بھٹو صاحب کی قربت تھی۔ شہید بھٹو کی پارٹی کے قیام سے پہلے لاہور، لائلپور، گجرات

کے دوروں کے دوران عوام کی طرف سے والہانہ اظہار محبت کے کیا کیا واقعات پیش آئے ،تاسیسی اجلاس میں لاہور ،قصور ،راولپنڈی ،فیصل آباد ،سرگودھا ،ملتان ،ساہیوال ،وہاڑی اور سندھ سے شریک ہونے والے مندوبین کون تھے ۔لیفٹ کی بھٹو شہید سے نفرت کے محرکات کیا ہیں ۔ہالا کنونشن میں معراج محمد خان کی طرف سے پرچی کی بجائے برچھی سے خون سوشلسٹ انقلاب کے مطالبہ پر قائد عوام نے کیا جواب دیا۔۔۔۔یہ سب کچھ جاننے کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ،رکن ،شہید بھٹو کے ساتھی ،ترقی پسند دانشور ،شاعر ،محقق وادیب جناب اسلم گورداسپوری کا چشم کشا مضمون ۔

عام تاثر یہی تھا اور اب بھی ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی والے کھلے ،ڈلے ،منہ پھٹ ،سرکش ، اپنی لیڈر شپ کے ساتھ زیادہ فرینک قسم کے لوگ ہوتے ہیں جبکہ مسلم لیگیے عموماً کاروباری ٹائپ ، میسنے ،موقع شناس و موقع پرست چاپلوس قسم کی طبیعتوں کے مالک ہو تے ہیں جو کبھی ''گیلے'' پر پاؤں نہیں رکھتے ،رسک نہیں لیتے ،انتہائی لچکدار ''کردار'' کے حامل ہوتے ہیں ۔ماضی کی حد تک یہ تاثر شاید درست

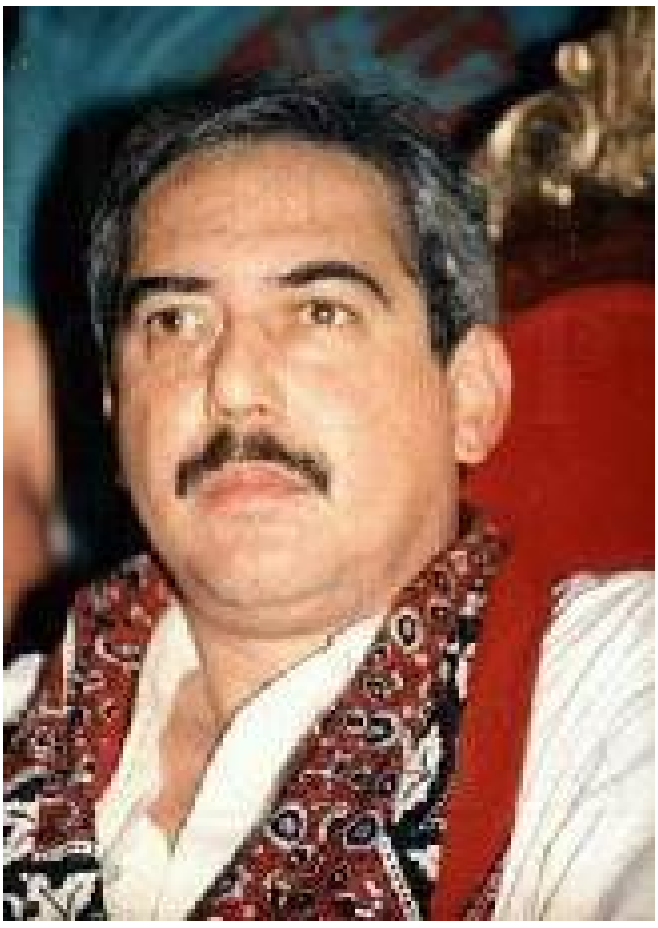

بھی تھا کہ معراج محمد خان ،مختار رانا آف لائلپور ،جے اے رحیم اور حنیف رامے جیسے نرم مزاج ،دانشور مصور فنکار قسم کے لوگ بھی بھٹو جیسے بندے کے خلاف ڈھے گئے ۔جبکہ مسلم لیگ کے مزاج

میں سازش اور ٹانگیں کھینچنا تو موجود تھا لیکن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مزاحمت کا رواج ہرگز نہیں تھا لیکن اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ رولز ہی ریورس ہو گئے جس کی تازہ ترین مثالیں مریم اور بلاول ہیں۔ بلاول پاکستان پیپلز پارٹی کے سینئر رہنماؤں کی گود میں کھیلا ہے۔ ممکن ہے بھلے وقتوں میں دو چار چھ قائدین کی گود گیلی بھی کی ہو لیکن جب اس کل کے بچے کو سکائی لیب کی طرح پارٹی کی صف اول لیڈرشپ کے اوپر مسلط کیا گیا تو کسی طرف سے چوں کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ مجال ہے جو کسی ایک ''جمہوری چیمپئین'' نے بھی احتجاج کرتے ہوئے کہا ہو کہ یہ فیصلہ نہ جمہوریت کے لیے ٹھیک ہے نہ پارٹی کے لیے درست ہے نہ خود بلاول کے لیے صحیح ہوگا۔ بلاول بے شک پارٹی کی قیادت کرے لیکن چند سال بعد اور تب تک اسے مختلف پوزیشنز میں کام کر کے مختلف قسم کے تجربات سے اور پوری طرح بالغ ہونے کا موقع دیا جائے لیکن نہیں۔۔۔۔ کے پھنے خانوں نے ''فردِ واحد'' ابو بلاول آصف زرداری کا یہ فیصلہ مٹی کے مادھوؤں کی طرح تسلیم کر لیا کہ شاید یہی ان کی اس بدصورت جمہوریت کا حسن اور عوام سے انتقام ہے۔ کسی نے سوچنے کا تکلف تردد بھی نہیں کیا کہ جو پارٹی اپنے سینئر ترین قائدین سے انصاف نہیں کر سکتی وہ عوام کے ساتھ کیا کرے گی۔ جو خود اپنے اندر میرٹ کو اس طرح روندتے اور ذلیل کرتے ہیں وہ باہر کیا کریں گے؟ یہ درست کہ معاشرہ بری طرح شخصیت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہے جو کسب نہیں نسب پر ریجھتا ہے لیکن

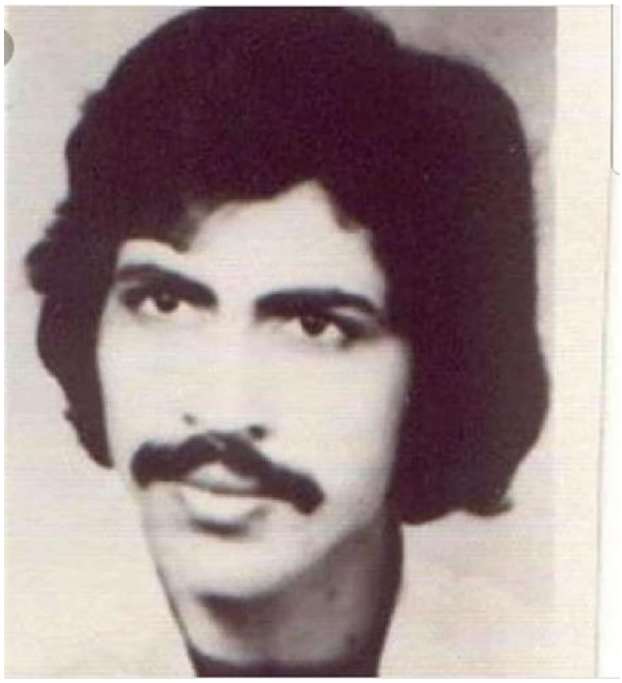

دکھاوے کی حد تک ہی سہی
۔۔۔چند سال ہی انتظار
کر لیا ہوتا لیکن نہیں
.....نہ پارٹی کے پروپرائٹر کو
شرم آئی نہ اس نام نہاد سینئر
قیادت کو جس نے اتنی ہی
بے شرمی سے یہ فیصلہ قبول کر
لیا۔ مجھے سو فیصد اعتماد ہے
کہ اگر پارٹی کے سب نہ سہی
صرف آٹھ دس بزرگ

اپنے سفید بالوں کی لاج رکھتے ہوئے بیک وقت نرم سا احتجاج ریکارڈ کرواتے ہوئے یہ عرض کر دیتے کہ اگر زرداری صاحب اپنا فیصلہ واپس نہیں لیتے تو مجبوراً ہمیں واپس گھر وگھری جانا ہوگا لیکن نہیں .....خدا جانے بے عزت ہونے میں ایسی کونسی لذت ہے جسے چھوڑنا ممکن نہیں ۔پیپلز پارٹی کے ہی پرانے جیالے اسلم گورداسپوری کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

زندگی اتنی غنیمت تو نہیں جس کے لیے
عہد کم ظرف کی ہر بات گوارا کر لی

دوسری طرف مسلم لیگ نون کی حیران کن پرفارمنس ہے جس کے چند باوقار چند سینئر لوگوں نے نواز شریف کو ''مائنس مریم'' فارمولا تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔میں یہ بات اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے تناظر میں عرض کر رہا ہوں اور ان لوگوں کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے پاکستان کے سیاسی کلچر میں یہ نئی روایت متعارف کرائی ہے۔یہ رویہ جمہوریت کو اصلی اصلی حقیقی جمہوریت

کے قریب تر کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ہماری تقریباً تمام تر سیاسی قیادت 66 تا 70 سال کے درمیان ہی اپنی زندگی کے بڑے نوٹ خرچ کرنے کے بعد اب میری طرح ان کے پاس بھی ریز گاری کے سوا کچھ نہیں۔سو ظاہر ہے مستقبل بلاول اور مریم کی نسل کا ہی ہے۔یہ جم جم آئیں، سر

آنکھوں پر، چشم ما روشن دل ما شاد لیکن وقار کے ساتھ مرحلہ وار آئیں۔ پوری طرح تیار آئیں کسی چھوٹے موٹے پراسیس سے گزر کر آئیں تا کہ ان کی آمد باعزت، مستحکم، مضبوط اور دیرپا ہو۔ اخبار یا یوں کہیں کسی بھی کاروبار کا مالک اوورنائٹ کچھ بھی اپنے بچوں کے سپرد نہیں کر دیتا کہ اس سے کاروبار ہی نہیں برخوردار بھی نقصان میں رہتا ہے۔ لائلپور میں میرے 80 فیصد کلاس فیلوز، دوستوں کا تعلق تگڑے کاروباری گھرانوں سے تھا۔ کسی ایک کو بھی ایک جست میں گدی نصیب نہیں ہوئی، متعلقہ کاروبار کے ہر شعبے کی سیر کرائی گئی پھر کہیں جا کر اڈے پر بیٹھے۔۔۔ یہاں تو کاروبارِ حکومت کا معاملہ ہے جب تک موروثیت کے مرض سے نجات نہیں ملتی۔ ضرور لاؤ اپنی اولادوں کو لیکن کسی سلیقے اور رنگ ڈھنگ سے کہ نہ ان کے بزرگ جو کر دکھائی دیں نہ یہ خود۔ بلاول، مریم موسٹ ویلکم لیکن بھونڈے طریقے سے نہیں۔

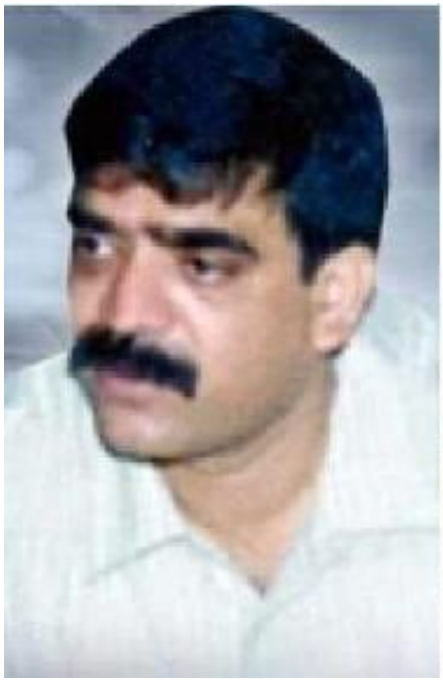

شاہی قلعہ

شاہی قلعہ کے یہ کھنڈرات پاکستان پیپلز پارٹی کی ظلم و جبر کے خلاف ایک طویل جان گسل جدوجہد کی یاد دلاتے ہیں۔ کامریڈ امتیاز خان جو کہ لندن میں رہتے ہیں راولپنڈی میں محلے دار ہونے کے ساتھ ساتھ شاہی قلعہ میں بھی ہمسایہ تھے پاکستان گئے تو چند تصاویر پوسٹ کر کے پرانی تلخ مگر خوبصورت یادیں تازہ کر دیں دن کو اگر یہ شاہی قلعہ تشدد مار پیٹ کی آوزوں سے گونجتا تھا تو شام ہوتے ہی ترانوں گانوں اور باتوں کی محفلیں سج جاتیں۔ جیالے پنجاب بھر سے گرفتار کر کے لائے جاتے رہے آخر شاہی قلعہ کے سیل کم پڑ گئے تو 20 نئے سیل بنانے پڑ گئے بہت سو کو تو لال قلعہ لاہور منتقل کیا گیا۔ اب سنا ہے کہ عقوبت خانوں کا یہ حصہ گرا دیا گیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسے دوبارہ تعمیر ہونا چاہیے کہ آنے والی نسلوں کو بتا سکیں کہ مارشل لاء کے خاتمہ اور جمہوریت کے لیے جنگ لڑنے والوں کو کہاں اور کیسے رکھا جاتا تھا۔

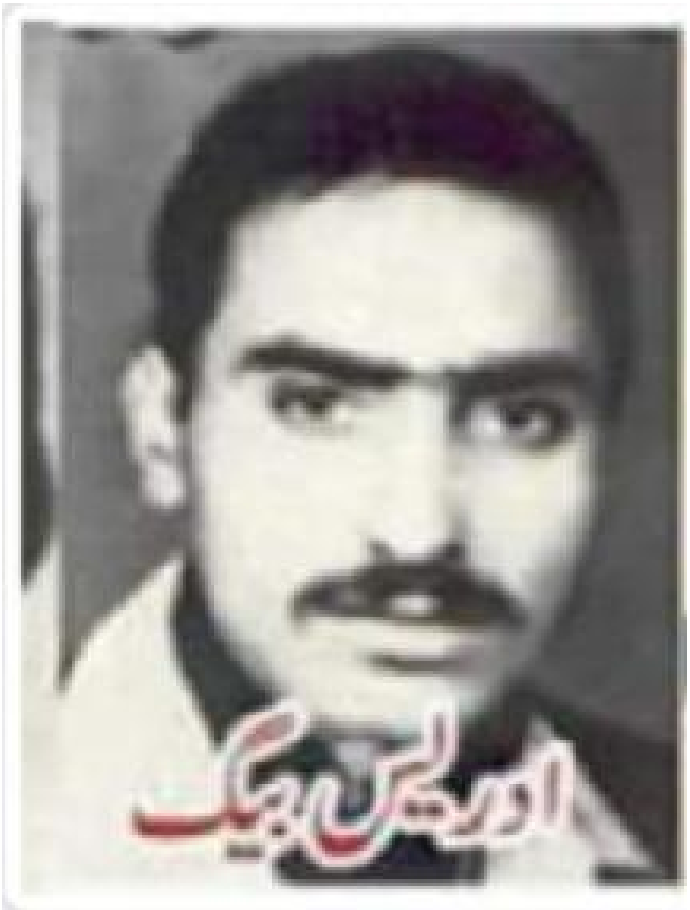

لال

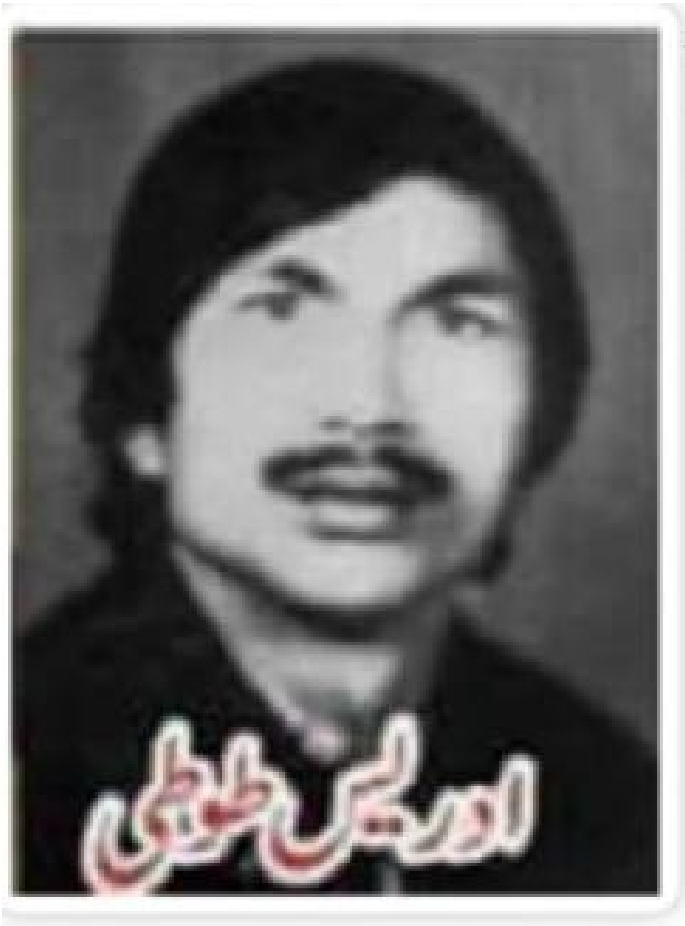

سلام

تاریخ سو پردوں کو چیر کر بھی سچ بولا کرتی ہے
تاریخ ہمیشہ مظلوم کے ساتھ کھڑا رہتی ہے

لال سلام بھٹو

سید قمر عباس

وہ پشاور یونیورسٹی کی طلبہ کی سیاست میں متحرک تھے اور پی ایس ایف کے مقبول رہنما تھے ۔سید قمر عباس نے ہم سے کہا کہ قاضی سلطان محمود صاحب سے کہو کہ مجھے کچھ دن دیں ان شاء اللہ

خیبر پختونخواہ کے طلبہ پنجاب کے طلبہ کے شانہ بہ شانہ تحریک چلائیں گے۔ہم واپس راولپنڈی آ گئے دوسرے دن رات کو بی بی سی اردو سنا کہ پشاور یونیورسٹی کے طلبہ کا بھرپور احتجاج یونیورسٹی بند کردی گئی جمرود روڈ مکمل بلاک سید قمر عباس شہید ایک بہادر انسان تھے وہ مشہور شاعر فارغ بخاری کے صاحبزادے تھے۔پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانیوں میں سے تھے۔ساری زندگی جدوجہد میں گزاری متعدد بار جیلوں میں گئے ان کی شہادت سے پیدا ہونے والا خلاء آج تک پر نہیں ہوسکا

۔

یہ سال 1972 کی بات ہے اور غالبا مہینہ بھی فروری کا تھا کیونکہ مجھے یاد ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کو برسر اقتدار آئے ہوئے یہی کوئی مہینہ ڈیڑھ ہوا تھا۔میں ان دنوں گورڈن کالج راولپنڈی کی سٹوڈنٹس یونین کا صدر تھا۔چونکہ بھٹو صاحب نے جنرل یحی کو replace کیا تھا اس لیے وہ نہ صرف ملک کے صدر تھے بلکہ مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر بھی تھے۔اسی اعتبار سے

صوبوں کے گورنر،ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ٹھہرے پنجاب میں غلام مصطفی کھر کے پاس یہ عہدہ

تھا۔کھر صاحب نے صوبے امور چلانے کے لیے ایک کابینہ تشکیل دے رکھی تھی ۔جس میں راولپنڈی سے منتخب شدہ ایم این اے خورشید حسن میر تعلیم کا مشیر بنایا گیا تھا۔میں نے صدارت کا الیکشن بھاری اکثریت سے جیت رکھا تھا۔نسبتاً آسانی سے کیونکہ گزشتہ سال بھی میں نائب صدر رہ چکا تھا۔نائب صدارت کا الیکشن کافی مشکل تھا کیونکہ میرے مدِ مقابل نئیر بخاری تھے، جو بعد میں ملکی سینٹ کے صدر بنے اور آج کل پیپلز پارٹی کے معروف لیڈر ہیں۔

مجھ میں جہاں اور بے پناہ خامیاں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ مجھے کسی کے پیچھے پیچھے چلنا گوارہ نہیں میں یا تو آگے آگے چلوں گا اگر یہ ممکن نہیں تو پھر الگ ہو کے اکیلا ہی چل دوں گا۔اس لیے میں نے یہ دونوں مندرجہ بالا الیکشن بطور آزاد امیدوار لڑے اور جیتے یہی وجہ ہے کہ سیاسی ذہن رکھنے کے باوجود کبھی کسی سیاسی جماعت میں شامل نہیں ہوا ۔مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی

سیاسی جماعت جوائن کرتا بھی تو انہوں نے مجھے پارٹی سے جلد ہی باہر نکال پھینکنا تھا کیونکہ مجھ میں ایک اور خرابی یہ بھی ہے کہ میں نے اپنے دل اور زبان کے درمیان منافقت اور مصلحت کے فلٹر نہیں لگا رکھے۔تمہید ضرورت سے زیادہ لمبی ہوگئی بتانا یہ تھا کہ فروری 1972ء کا ہی کوئی ایک دن تھا کہ میں اپنے دوست حبیب خان کے ساتھ کالج آیا،تو دیکھا کہ کالج تقریباً خالی ہے اور کوئی سٹوڈنٹ

نظر نہیں آ رہا۔ میں نے سوچا کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔ اور یوں کالج میں چھٹی کر دی گئی ہو خیر تھوڑا آگے ہی بڑھا تھا کالج کا چپڑاسی عاشق نظر پڑا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کالج میں چھٹی نہیں بلکہ سارے سٹوڈنٹس جوبلی ہال میں ہیں اور کوئی فنکشن ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کالج میں طالب علموں کا کوئی فنکشن ہو اور مجھے اس بات کا علم ہی نہ ہو؟ خیر جب جوبلی ہال پہنچا تو دیکھا کہ اسٹیج پر خورشید حسن میر صاحب تشریف فرما ہیں اور ساتھ ان کے کالج کے پرنسپل صاحب بیٹھے ہیں اور ایک پروفیسر روسٹرم سے میر صاحب کے بارے میں کچھ فرما رہے ہیں۔

میں چلتا ہوا سیدھا اسٹیج پر چلا گیا اور پروفیسر صاحب سے معذرت کرتے ہوئے مائیک پہ آ گیا اور پرنسپل کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا ''محترم پرنسپل صاحب! تو انہیں سٹاف روم میں ملوایئے۔ لیکن طلبہ کو بھاشن تب تک نہیں دے سکتے جب تک میں اجازت نہ دوں۔'' اس پر کچھ پیپلز پارٹی کے حامی طلبہ نے احتجاج کرنے کی کوشش کی اور یہ دیکھتے ہوئے میر صاحب بھی پکے ہو گئے اور اسٹیج چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس پر میری طالب علموں کو صرف اتنا کہنے کی دیر تھی کہ ''آپ لوگ میر صاحب کے باہر جانے میں مدد کریں'' کہ انہوں نے میر صاحب کے پیر زمین پر نہ لگنے دیے اور اپنے کندھوں پر اٹھا کر ہال کے طویل ترین راستے سے ہوتے ہوئے باہر کی سیڑھیوں پر جا کر پھینک دیا۔ اس ہوائی سفر کے دوران مجھے یقین ہے کہ میر صاحب نے سوچا ہو گا کہ ان سے سیاسی غلطی سرزد ہو گئی ہے کیونکہ کندھوں سے اترتے ہی انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی خیر میں چلا گیا وہ کہنے لگے کہ ان کا کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا۔ بس ایک غلط فہمی سمجھیں اور یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ طالب علموں کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کر دیں۔ میں نے کہا کہ ضرور کیجیے۔ اس پر وہ اپنی سرکاری کار کی چھت پر چڑھ گئے اور خطاب شروع کر دیا۔ طالب علم تھے کہ ان کی بات سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے میں بھی کار پر چڑھ گیا اور سب کو تلقین کی کہ میر صاحب کو سنا جائے۔ یہ تصویر اسی لمحہ کی ہے۔

یہ وہ دن تھے کہ بڑے سے بڑا سورما بھی حکومت کے خلاف چوں تک بھی نہیں کرتا تھا اس کے وزیر کو نکال دینا تو دور کی بات ہے لیکن ہماری بھی جوانی کے دن تھے کہ جب ہم بقول اقبال:

تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

چونکہ حکومت کو اقتدار میں آئے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے اور انہیں فوری نوعیت

کے اور بہت سے مسائل سے واسطہ تھا۔اس لیے میری بحث ہوگئی ۔ورنہ یہی حرکت سال ایک دو کے بعد ہوئی ہوتی تو کسی سڑک کے کنارے مار دیا جاتا۔ یا کسی دلائی کیمپ میں گل سڑ گیا ہوتا اور یہ تحریر لکھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

سینتالیس سال پرانی بات ہے،سوچا سنا ہی دوں

کیونکہ بقول یارِ دیرینہ شعیب بن عزیز:

میری صورت سے نہ کر میری حقیقت کا قیاس
میری بنیادوں میں جو تھا میرے ملبے میں نہیں

شاہد مسعود

اساں مرنا ناہیں

اج وی ساکوں یاد اے مرشد

پہرے دار دی گھات
یار ہاں سال دی رات
پیریں اچ زنجیراں پا کے
نچدے گاندے لوگ
بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں
وسدی راہسی جھوک

بھٹو آج تک لوگوں کے دلوں میں کیوں زندہ ہے؟ وجہ

یہ ایک تاریخی تصویر ہے۔ایک بوڑھا شخص 18 اکتوبر 2007ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو شہید

کے استقبال کے لیے کراچی ائیر پورٹ ننگے پاؤں آیا۔اس نے وہاں موجود صحافیوں کو یہ تصویر دکھائی اور بتایا کہ میں آج اس واقعے کو دہرانا چاہتا ہوں جب میں اس طرح شہید بھٹو سے ملنے ننگے پاؤں گیا تھا کیونکہ میرے اس وقت پہننے کے لیے جوتے نہیں تھے۔شہید بھٹو نے جب میری یہ حالت دیکھی تو انہوں نے مجھے اپنے گلے سے لگایا۔میں نے ان کی آنکھوں میں بغور دیکھا تو وہ بھیگ چکی تھیں۔انہوں نے مجھے کافی پیسے بھی اور جب میں واپس جائے لگا تو شہید بھٹو اپنے جوتے اتار کے خود بھی ننگے پاؤں میرے ساتھ کافی دور تک چلے!

بزدل قوم کا بہادر لیڈر

4اپریل 1979ءکو بھٹو صاحب کو گڑھی خدا بخش دفن کر دیا گیا۔6اپریل کو فوج کا پہرہ ختم

ہواتو پاکستان پیپلز پارٹی کے قائدین فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔ان میں بھٹو کے وکیل یحیٰ بختیار بھی تھے جب گاؤں پہنچے تو لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور پوچھنے لگے آپ تو ہمارے لیڈر کے سب سے قریب تھے۔آخری وقت انہوں نے کوئی پیغام دیا یا کچھ کہا۔یہ سن کر یحیٰ بختیار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولے بھٹو صاحب نے آخری ملاقات میں مجھ سے کہا ''بزدل قوموں کے بہادر لیڈروں کا یہی انجام ہوتا ہے''

محمد سعید بھٹہ ایڈووکیٹ

ایک جہد مسلسل، ایک طاقت، ایک جرات، ایک مزاحمتی کردار، ایک جذبہ ایک ہمت، ایک

رول ماڈل، ہر دلعزیز بلند پایہ مقرر افکار و نظریات کا پاسبان اور اس بانجھ معاشرے میں ایک روشن دماغ کا نام محمد سعید بھٹہ ہے۔ سیاست اور پارٹی انھیں وراثت میں ملی ہے۔

مشعلیں کرو روشن
دور تک اندھیرا ہے

موصوف وہ عظیم رہنما ہیں جو اس وطن کو آمریت کے سیاہ اندھیروں سے نکال کر جمہوریت کے اجالے میں لانے کے لیے مسلسل جدو جہد کرتے ہیں۔ عدلیہ بحالی تحریک ہو یا ایم آر ڈی تحریک ہو۔ ہمیشہ وہ اگلی صفوں میں نظر آئے انہیں کم سن عمری میں ہی مسلسل تین مرتبہ پنجاب بار کونسل کا ممبر، جنرل سیکرٹری ڈسٹرکٹ بار گجرانوالہ اور ڈسٹرک بار ساہیوال کا فنانس سیکرٹری ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ مسلسل 16 برس تک پنجاب بار کونسل کے در و دیوار ان کی گرج دار تقریروں سے گونجتے رہے۔

ہم نے سیکھا ہے اذان سحر سے یہ اصول
لوگ خوابیدہ ہی سہی ہم نے صدا دینی ہے

جب بھی مقتل سجا ہم ہی آگے بڑھے
دار پر دیکھ لو ہم ہی تھی جو چڑھے

چھوٹے قد کا بڑا آدمی

قاضی سلطان محمود مرحوم کو ہم سے بچھڑے پانچ سال ہو گئے۔ میرے سیاسی استادوں میں

دولوگ شامل ہیں۔قاضی سلطان محمود اور سابق سینئر استاد سردار سلیم صاحب۔جن سے نہ صرف بہت کچھ سیکھا بلکہ 1978ء میں شروع ہونے والا مزاحمتی سیاست کا سفر ان کے ساتھ راولپنڈی اس لحاظ سے خوش قسمت شہر تھا جسے پاکستان پیپلز پارٹی کی سیاست میں نہ صرف نمایاں مقام حاصل رہا ہے بلکہ سردار سلیم صاحب اور قاضی سلطان محمود مرحوم جیسی بہادر قیادت ملی دونوں بائیں بازو کی ترقی پسند سیاست پر یقین رکھتے تھے۔ان کی سوچ فکر نے میرے جیسے سینکڑوں کارکنوں کی سیاسی تربیت کی جنہوں نے آگے چل کر جنرل ضیاء الحق کے خلاف جمہوریت کی بحالی کی جنگ میں بھرپور کردار ادا کیا۔

چھوٹے قد کا بڑا آدمی جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف مزاحمتی تحریک کا ایک اہم کردار سلطان محمود قاضی۔1979ء بلدیاتی انتخابات کا بگل بج چکا تھا راولپنڈی میں ٹکٹوں کی تقسیم ہو چکی تھی ہمارے حلقہ میں سنا تھا کہ ٹکٹ شیخ جلیل اختر مرحوم کو ملا ہے جو پی پی وارڈ کمیٹی ڈھیری حسن آباد کے چیئرمین تھے۔ایک صبح دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ملک الطاف حسین مرحوم کھڑے تھے۔میرا ان سے کوئی تعارف نہ تھا لیکن بلدیاتی انتخابات کے بعد تو ملک صاحب میرے قریب ترین دوستوں میں شامل ہوئے۔شاہی قلعہ تک اکٹھے گئے۔ملک الطاف حسین مرحوم نے بتایا کہ انہیں پاکستان پیپلز پارٹی نے وارڈ نمبر 5 سے ٹکٹ دیا ہے۔میں نے انہیں کہا کہ میری تو ابھی ووٹ بھی نہیں بنی میں میٹرک کا طالب علم ہوں تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ مجھے باہر دکاندار چاچا شفیق نے بتایا کہ اس محلے کے ووٹ حاصل کرنے ہیں تو ظفر سے ملو وہ چھوٹا ہے مگر پاکستان پیپلز پارٹی کا زبردست سپوٹر ہے۔میں نے ٹکٹ کے متعلق کہا کہ سنا تھا کہ ٹکٹ شیخ جلیل اختر مرحوم کو ملا ہے تو وہ کہنے لگے کہ انہیں ہی الیکشن لڑنے کے لیے کہا گیا تھا لیکن وہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے تو ٹکٹ مجھے مل گیا۔میں نے کہا ٹھیک ہے اگر آپ کو ٹکٹ مل گیا ہے تو آپ کی بھرپور سپورٹ کروں گا پھر بھی میں نے تفصیل کے لیے علاقے کے کارکن طفیل قریشی کو ساتھ لیا اور قاضی سلطان محمود مرحوم کے گھر جھنڈا چچی چلا گیا وہ اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی راولپنڈی کے جنرل سیکرٹری تھے۔قاضی صاحب ک وتو ویسے میں چیئرمین بھٹو شہید کی رہائی کی تحریک میں اکثر کمیٹی چوک میں ہوئے مظاہروں میں دیکھا کرتا تھا مگر میرا تعارف نہیں ہوا تھا خیر جھنڈا چچی ان کے گھر میں ان سے پہلا تعارف تھا وہ بھی صرف ٹکٹ کنفرم کرنے کی حد تک۔میرا تعلق ہائی سکول میں ہی

پیپلز سٹوڈنٹس سے جڑ چکا تھا اس لیے پارٹی سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ بلدیاتی انتخابات میں آہستہ آہستہ پارٹی کے لیڈران سے تعلق بنا۔ اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی کالعدم پیپلز پارٹی تھی۔ اقبال روڈ پر موجود دفتر سیل ہو چکا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت پارک ہوٹل میں بیٹھا کرتی تھی جس میں سردار سلیم قاضی سلطان محمود مرحوم، رشید میر، آغا محمد اقبال، بابو رشید مرحوم، غضنفر علی شاہ نمایاں تھے۔ میں پھر اکثر پارک ہوٹل ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں اپنے ساتھی شیخ عبدالقیوم جو آج لندن میں ہیں بھی دوستی ہوئی کو کہ میرے علاقے میں رہتے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کسی لیڈر کے پاس اپنی گاڑی تک نہ تھی سب میری طرح بسوں ویگنوں ٹانگہ ٹیکسی یا پیدل مارچ ہوتے۔ شیخ عبدالقیوم کے پاس اپنی موٹر سائیکل تھی تو پارک ہوٹل آنا جانا مستقل ہو گیا۔ بلکہ اکثر واپسی پر ہم قاضی سلطان محمود کو اپنے ساتھ بٹھاتے اور جھنڈا چچی ان کے گھر اتار کر گھر جاتے۔ بلکہ ہم دونوں کی حیثیت ان کے فیملی ممبر جیسی ہو گئی۔ جب بھی ان کے گھر جاتے وہ کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیتے جہاں ان کے بھانجوں بھتیجوں سے بھی دوستی ہو گئی یہاں قاضی صاحب کے بھانجوں بھتیجوں کا کردار بھی قابل تحسین ہے کہ اگر وہ ساتھ نہ دیتے تو ان کی سیاسی جدوجہد کبھی کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ قاضی صاحب اور سردار سلیم صاحب کو میں اپنے سیاسی استادوں میں شمار کرتا ہوں۔ جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا قاضی صاحب مجھے لیکچر کے علاوہ کتابیں بھی پڑھنے کے لیے دیتے۔ سبط حسن کی کتابیں انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے دیں بائیں بازو کی سیاست پر یقین رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ بابائے سوشلزم شیخ رشید کے اتنے قریب تھے۔ ان کے کہنے پر ہم مارشل لاء کے خلاف پوسٹر، پمفلٹ تقسیم کرتے جنرل ضیاء الحق کے خلاف وال چاکنگ کرتے تھے۔ جب میر مرتضی بھٹو نے الذوالفقار تنظیم بنائی تو اس میں قاضی سلطان محمود سمیت پاکستان پیپلز پارٹی کا سب سے اہم رول تھا۔ کابل جانے سے پہلے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا یہ آگ اور خون کا راستہ ہیجان ہتھیلی پر رکھ کر کفن سر پر باندھ کر جدوجہد کرنا ہوگی۔ تم تیار ہو تو ٹھیک ہے اس طرح انہوں نے میرے سمیت شیخ عبدالقیوم، سید فیاض حسین شاہ، ریاض ساجد، مرزا اختر بیگ، نعیم اختر وارثی، سائیں تاج مرحوم، حامد سعید پیا مرحوم، محمد شفیع، رفعت بابا، زاہد شاہ، مرزا ادریس بیگ شہید، اشفاق علی مرحوم اور بہت سے کارکنان کو کابل بھیجا جب انہیں گرفتار کر کے شاہی قلعہ بھیجا گیا تو میں اس وقت شاہی قلعہ سے تفتیش مکمل ہونے کے بعد کوٹ

لکھپت جیل شفٹ ہو چکا تھا۔ جب جیل منتقل ہوئے تو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے میں تم سے بہت خوش ہوں اتنی کم عمری کے باوجود تم نے دلیری سے شاہی قلعہ کاٹا۔ میرا شاگرد ہونے کے باوجود کہیں بھی تم نے میرا نام نہیں لیا میرا اور امتیاز خاں کا چونکہ ہم دونوں جیل میں کم عمر قیدی تھے بہت خیال رکھتے تھے ان کے ساتھ جیل میں رہنے کا ایک الگ ہی تجربہ تھا۔ جہاں بہت کچھ سیکھنے کو ملا جیل میں سب ساتھیوں کا حوصلہ بڑھاتے کئی سال گزرنے کے بعد انہیں رہائی ملی تو اپنی خوبصورت لکھائی میں مجھے جیل سے خط لکھتے رہے جو میرے پاس آج بھی موجود ہیں اور عید کارڈ بھیجنا نہ بھولتے تھے۔ لکھتا رہوں تو ان کی شخصیت اور ان کی جدوجہد پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ قاضی سلطان محمود مرحوم پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے لیے ایک مشعل راہ کا نام ہے جنہوں نے ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود 10 سال تک راولپنڈی جیسے شہر کی صدارت اور جنرل سیکرٹری کے فرائض انجام دیے۔ چیئرمین بھٹو سے لے کر میر مرتضی بھٹو شہید اور محترمہ بے نظیر بھٹو شہید، آصف علی زرداری اور بلاول بھٹو کے ساتھ کام کیا۔ آخری عمر میں بالآخر پاکستان پیپلز پارٹی کے اہم ترین عہدے سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن بنے۔ جناب آصف علی زرداری نے ان کی خدمات اور بیش بہا قربانیوں کو سراہتے ہوئے کراچی کی ایک شاہرہ کا نام قاضی سلطان محمود روڈ رکھا۔

ذولفقار علی بھٹو کی سپریم کورٹ میں آخری تقریر

بعدازاں اپیل کنندہ کے ذریعے عدالت میں ایک تحریری درخواست بھی پیش کی گئی تھی جس

میں اس معاملے کے کچھ پہلوؤں پر ذاتی طور پر عدالت سے خطاب کرنے کے موقع کی درخواست کی گئی۔ اس درخواست کی اجازت دی گئی اور اسی مناسبت سے اپیل کنندہ 1978ء میں 18 سے 21 دسمبر تک ذاتی طور پر چار دن عدالت میں پیش ہوا۔ اپیل کنندہ ذوالفقار علی بھٹو نے تقریباً بارہ گھنٹوں پر پھیلے ہوئے وسیع خطاب میں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات سے انکار کیا جو کہ بے مقصد، مستغیث اعلیٰ احمد رضا قصوری نے قتل کے گواہ ہونے سے متعلق لگائے تھے۔ اس وقت کے فیڈرل سکیورٹی فورس کے ڈائریکٹر جنرل اور گواہ مسعود محمود جنھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ شواہد میں سازش کے جرم کے کسی ضروری اجزا کی موجودگی کا انکشاف نہیں کیا گیا۔ یعنی متفقہ طور پر شریک سازشیوں خصوصاً مسعود محمود کی طرف سے جس نے اپیل کنندہ کی جانب سے سختی سے استدعا کی تھی اپیل کنندہ نے اس پر تبصرہ کیا کہ گواہوں، احمد رضا قصوری اور مسعود محمود کے ثبوت میں موروثی تضادات موجود ہیں اور عرض کیا کہ وہ ملک میں مارشل لاء کی مجبوری کے تحت کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر استغاثہ یہ چاہتا تھا کہ عدالت ملک میں بطور صدر اور وزیر اعظم اپنے عہدے کے دوران پاکستان میں موجود مبینہ معاشرتی حالت کا عدالتی نوٹس لے تو پھر اس طرح کا نوٹس بھی اس حقیقت پر لیا جانا چاہیے جو مارشل لاء کے تسلسل کے دوران مقدمے کی سماعت میں ثبوت اہم گواہ دے رہے تھے۔ انھوں نے سختی سے استدلال کیا کہ ان کے خلاف سارا مقدمہ جھوٹا اور من گھڑت تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ جسمانی اور سیاسی طور پر اسے ختم کر دیں اور وہ بے قصور تھا۔ انھوں نے سختی سے شکایت کی کہ ان کو ہائیکورٹ میں منصفانہ مقدمہ نہیں دیا گیا کیوں کہ مسٹر جسٹس مشتاق حسین نے لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے کی وجہ سے ان کے خلاف ذاتی تعصب کا اظہار کیا تھا کیوں کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی جس کی صدارت اپیل کنندہ نے کی تھی۔ اگست 1977ء میں الیکشن کمشنر کی حیثیت سے ان کی اہلیت میں ان کی طرف سے دیے گئے کچھ بیانات کے سلسلے میں ان کے ساتھ اس معاملے میں شامل ہو گئے تھے۔ انھوں نے ہائیکورٹ کے اپنے فیصلے کے پیراگراف 609 سے 616 تک کیے جانے والے مشاہدات پر کڑی تنقید کی۔ انھوں نے اسے صرف نام سے مسلمان قرار دیتے ہوئے طرز عمل کے نظریات پر قائم نہ رہنے کا بیان کیا۔ مسلمان حکمران کے لیے مشورہ دیا گیا کہ وہ اسلام قائم رکھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ یہ تقریر سراسر بلا جواز ہے اور ان کے خلاف ٹرائل کورٹ کے تعصب کا واضح ثبوت ہے۔ جیسا کہ درحقیقت

انھوں نے پاکستان کے سابقہ حکمرانوں سے کہیں زیادہ اسلام کی خدمت کی تھی۔ کیوں کہ وہ قدیم قادیانی مسئلے کو حل کرنے میں معاون تھا۔ لاہور میں اسلامی سربراہی اجلاس بلانے اور اس کا چیئر مین منتخب ہونے پر سعودی عرب کے مرحوم شاہ فیصل کے علاوہ کسی بھی شخص کی طرف سے پیش کردہ تجویز پر غور نہیں کیا گیا۔ جس نے ملک میں سیرت کانفرنس منعقد کی ایک لبرل جج پالیسی مرتب کی تھی ۔ اتوار کی بجائے جمعہ کو چھٹی قرار دیا تھا۔ پاکستان ریڈ کراس کا نام تبدیل کر کے ہلالِ احمر کر دیا تھا اور بنیادی طور پر پارلیمنٹ کے ذریعہ 1973ء کے آئین کو متفقہ طور پر قبول کرنے کے لیے ذمہ دار تھا۔ انھوں نے عرض کیا کہ ان کامیابیوں کے باوجود بحیثیت مسلمان طرزِ عمل مقصد اسلام، ہائیکورٹ کے پاس کوئی جواز نہ تھا اور نہ ہی وہ مجاز تھی کہ وہ اس طرح کی نوعیت کا انکشاف کرے۔

انھوں نے یہ بھی عرض کیا کہ حکومت کے کسی بھی سربراہ کو اپنے عہدے کے دوران ریاست میں ہونے والے انفرادی جرائم کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس نے فیصلہ کے 613 سے 616 کے پیراگراف میں شامل مبینہ خفیہ کارروائی پر ناراضی ظاہر کی جو ایک مسلمان حکمران کے طرزِ عمل اور طرزِ حکومت سے متعلق اسلامی احکامات کے منافی ہے۔ اپیل کنندہ ذاولفقار علی بھٹو نے اپنے تمام چار دنوں پر مشتمل پیش ہونے پر عدالت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور عدالت کا شکریہ بھی ادا کیا کہ عدالت نے انھیں ذاتی طور پر ایک طویل خطاب دینے کا موقع فراہم کیا۔ حالاں کہ ان کے وکیل پہلے ہی تمام پہلوؤں پر مکمل گزارشات پیش کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطاب کا اختتام خواجہ غلام فرید کے اس شعر پر کیا:

درداں دی ماری جندڑی علیل اے
سوہنا نہیں سن دا دکھاں دی اپیل اے

چیئرمین بھٹو شہید کے بہادر اور غیرت مند بیٹے

میرے لیڈرز میر مرتضی بھٹو اور شاہ نواز بھٹو شہید کی ایک نایاب وڈیو۔ کابل میں کافی عرصہ

مجھے مرتضی بھٹو اور شاہ نواز بھٹو کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ جیسا کہ اس وڈیو میں آپ نے دیکھا دونوں کو اتنا ہی دلیر اور بہادر پایا۔ دونوں نے جس بہادری سے جنرل ضیاء الحق سے جنگ لڑی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس لڑائی میں میر مرتضی بھٹو اور شاہنواز بھٹو کا جس طرح کرنل قذافی اور حافظ السد نے ساتھ دیا انہوں نے چیئرمین بھٹو سے اپنی دوستی کا حق ادا کیا۔

مجھے فخر ہے کہ میں میر مرتضی بھٹو شہید اور شاہ نواز بھٹو شہید کے قافلے کا ایک سپاہی تھا۔

سکھر جیل کی 48 سینٹی گریڈ کی گرمی میں پھٹ چکی جلد، پھنسیوں سے بھر چکے جسم، کان کے شدید انفیکشن میں مبتلا نصرت بھٹو کی پنکی (بے نظیر) جو پیلے گدلے پانی سے پیاس بجھانے کی ناکام

کوشش کرتی رہتی ہے اسے ماں اپنی قید سے اس کی قید میں خط بھیجتی ہے.....

میری بہت ہی پیاری پنکی!

دن میں تین چار مرتبہ اپنے جسم پر پانی ڈالوتا کہ حدت کم محسوس ہو۔اس کو آزماؤ، میں بھی سر جھکا کر گردن کے پیچھے اور سر کے اوپر پانی کے مگ ڈالتی ہوں۔پھر پنکھے کے نیچے بستر پر لیٹ جاتی ہوں۔اس طرح کپڑے خشک ہونے تک بہت ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے۔اس طریقے سے پھنسیوں سے بھی حفاظت رہتی ہے۔یہ شاندار نسخہ ہے۔میں اس کی پرزور سفارش کرتی ہوں۔

پیار کے ساتھ

تمہاری ممی

ٹر گئے یار محبتاں والے

ٹر گئے یار محبتاں والے

لے گئے نال ای ہاسے
دل نہیں لگدا یار محمد بخشا
جایئے کیہڑے پاسے

رشید میر بھی چلے گے

مرتے دم تک پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ وفا نبھانے والے پاکستان پیپلز پارٹی کے بانیوں میں شمار، سیاسی سفر خاصا مشکل اور طویل قید قربانیوں کی ایک اور داستان یوں تو راولپنڈی شہر قتل گاہ کہلاتا ہے جہاں چیئر مین بھٹو شہید اور محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کو قتل کیا گیا مگر اس کے ساتھ ساتھ راولپنڈی پاکستان پیپلز پارٹی کی مزاحمتی تحریک کا ایک اور اہم مرکز بھی رہا جہاں چیئر مین بھٹو شہید کی گرفتاری کے بعد کارکن کمیٹی چوک پر آ کر خودسوزیاں کرتے جیالے گرفتاریاں پیش کرتے بھٹو کو رہا کرو مارشل لاء ختم کرو جمہوریت بحال کرو کے نعرے لگاتے اور اس کے بعد انہیں گرفتار کر کے سمری ملٹری کورٹس میں پیش کیا جاتا چند منٹوں کی سماعت کے بعد ایک میجر ایک سال قید 10 کوڑوں کی سزا سناتا اور پھر انہیں کوڑے مارنے اور سزا کاٹنے جیل بھیج دیا جاتا۔ مرزا ادریس بیگ شہید کو بھی راولپنڈی جیل میں پھانسی دی گئی کارکنان پاکستان پیپلز پارٹی راولپنڈی کی جدوجہد کی تاریخ کی بڑی جان گسل ہے۔ مجھ سمیت شیخ عبدالقیوم، ریاض ساجد، نعیم اختر وارثی، حامد سعید پیا مرحوم، راؤ اشفاق علی مرحوم، راجہ جمیل عباسی، مزدور رہنما شفیع فیاض شاہ، چاچا اللہ داد مرحوم کو عمر قید سزائیں۔ لیاقت باغ فائرنگ کیس، موہن پورہ بم کیس میں بھی پاکستان پیپلز پارٹی راولپنڈی کے کارکنان کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ بابو رشید مرحوم، بابو لطیف مرحوم، امتیاز خان سرفراز شاہ راجہ طاہر مرحوم آغا اقبال، کرنل حبیب مرحوم، شیخ لیاقت، مراد شاز خٹک، ملک الطاف حسین مرحوم، شوکت بیگ مرحوم، غلام حسین آفریدی، ظفر الحق شاہ، غلام علی شاہ، غضنفر علی شاہ ایڈووکیٹ، عبدالقیوم بٹ مرحوم مشتاق بٹ مرحوم، نعیم بلا مرحوم، ملک غلام مصطفی، بلال سرور، آغا ریاض السلام، ریاض شہزاد، قاضی اشفاق، مرزا اختر بیگ، انور بیگ، محمد اشرف، خالد شاد، بیگم ریحانہ ملک، باجی نصرت شہید، سمیت سینکڑوں کارکنوں نے بے مثال جدوجہد کی جیلوں میں گئے۔ 1977ء کا مارشل لاء لگنے کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی سمیت تمام سیاسی پارٹیوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا اور پارٹی کے دفاتر سیل کر دیے گئے۔ جن میں پاکستان پیپلز پارٹی کا اقبال روڈ (کمیٹی

چوک) کا دفتر بھی شامل تھا تو پاکستان پیپلز پارٹی کے جیالوں کا مسکن پارک ہوٹل بنا جہاں روز شام کو پاکستان پیپلز پارٹی راولپنڈی کی قیادت سردار سلیم صاحب ،قاضی سلطان محمود مرحوم ،آغا اقبال مرحوم، بابو رشید مرحوم اور میر رشید مرحوم بیٹھا کرتے تھے۔تمام پارٹی ارکان وہیں ان سے ملاقات کرتے ۔چیئر مین بھٹو شہید کی پھانسی کے بعد گو پورے ملک میں سناٹا چھایا ہوا تھا مگر راولپنڈی کی قیادت کبھی سوئی نہیں۔ جہاں ہم لوگ بیٹھا کرتے تھے ریسٹورانٹ کے دوسرے کونے پر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اہلکار بھی بیٹھا کرتے تھے۔ایک دن جب نشست برخاست ہوئی ، اہل کار بل کی کاپی کاویٹر سے کہنے لگا تو سردار سلیم صاحب نے مذاقاً کہا ساڈا بل وی کدے دے دیا کرو، وہ ہنس کر کہنے لگے ہم نے حساب کتاب رکھنا ہوتا ہے تا کہ گورنمنٹ سے وصول کر سکیں۔آپ کا تو میلہ لگا ہوتا ہے۔ ہمارا چائے وغیرہ کا بل اکثر رشید میر مرحوم یا آغا اقبال مرحوم دیا کرتے تھے۔یہی ہوٹل تھا یہاں بیٹھ کر یا یہ کہہ لیں ایجنسیوں کی ناک کے نیچے الذوالفقار کی بھرتی شروع ہوئی، دھماکہ تب ہوا جب سلام اللہ ٹیپو کی خبر طیارہ اغوا کرنے کی بریکنگ نیوز آئی۔اس کے بعد تمام پارٹی انڈر گراؤنڈ چلی گئی ۔سردار سلیم صاحب اور آغا قبال کابل چلے گئے جبکہ قاضی سلطان محمود مرحوم رشید میر مرحوم بابو رشید شاہی قلعہ کے عقوبت خانے میں رشید مرحوم اور قاضی سلطان محمود مرحوم قید کاٹ کر واپس آئے تو انہیں پاکستان پیپلز پارٹی راولپنڈی کا صدر اور سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔جنہوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد پاکستان پیپلز پارٹی راولپنڈی کو ایک بار پھر بھرپور طریقے سے آرگنائز کر کی پاکستان پیپلز پارٹی کا قلعہ بنا دیا۔محترمہ بے نظیر بھٹو شہید جب اقتدار میں آئیں تو رشید میر کو او۔ ایس ۔ڈی پرائم منسٹر بنا دیا گیا۔رشید میر مرحوم نے اس پوسٹ پر بیٹھ کر بڑی دلجمعی سے عوام اور پارٹی کے کارکنان کی خدمت کی سینکڑوں کارکنوں کو نوکریاں دلوائیں۔ایک بار مجھے پتہ چلا کہ رشید میر صاحب نے دو مسلم لیگیوں کو نوکریاں دلوائیں ہیں میں نے پوچھا کہ میں کچھ ایسا سنا تو بولے بالکل دیں۔وہ میرے ہمسائے محلے دار تھے۔جب میں مروں گا تو تم میرے جنازے میں آؤ گے ؟ وہ سب سے پہلے پہنچیں گے۔ایک بار پارہ چنار کرم ایجنسی سے ہمارے پارٹی کے رہنما ملک نور احمد بنگش مرحوم جو میر مرتضی بھٹو شہید کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک تھے اپنے بھائی اور ڈرائیور کے ساتھ راولپنڈی آئے۔ملک نور احمد بنگش کے بھائی صاحب اور ڈرائیور شراب کے نشے میں دھر لیے گئے میں نے رشید میر کو مطلع کیا تو فوراً عدالت میں جا کر ان کی ذاتی طور پر ضمانت کروائی کہ

ہمارے مہمان ہیں اور ہمارے شہر میں ان کے دروازے ہر خاص و عام کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں مہمان نواز یاروں کے یار، شاہی قلعہ گئے تو ان کی کپڑے کی دوکان تھی۔ کٹڑہ راجہ بازار میں کاروبار تباہ ہو گیا مگر پارٹی سے کبھی گلہ شکایت نہیں۔ جیلوں میں جا کر سیاسی قیدیوں کی دادرسی کرنا ہر جگہ سب سے آگے۔ آخری عمر میں کینسر نے آ گھیرا اور وہ ہمیں الوداع کہہ گئے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ پارٹی ان جیسے جیالوں کی وجہ سے آج زندہ ہے۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنے ہارے بھی تو بازی مات نہیں

آہ آنٹی ڈاکٹر زبیدہ ملک

پاکستان پیپلز پارٹی میں جہاں جوانوں نے فوجی ڈکٹیٹرز کیخلاف بھرپور مزاحمت کی ہر طرح کا ظلم وتشدد برداشت کیا وہاں پاکستان پیپلز پارٹی کی خواتین کسی سے کم نہیں تھیں۔ڈاکٹرز بیدہ ملک اور کامریڈ شاہدہ جبین ایسی خواتین تھیں جنہوں نے اپنے بیٹے اور بھائی کو میر مرتضی بھٹو شہید کا ساتھ دینے کے لیے کابل بھیجا۔بڑا مشکل ہوتا ہے کسی ماں اور بہن کے لیے اپنے جگر کے ٹکڑے کو قربان گاہ کی طرف بھیجنا مگر انہوں نے چیئرمین بھٹو شہید کی محبت میں یہ قربانی دی۔ڈاکٹرز بیدہ ملک کا بیٹا محمد رفیع ملک مرحوم ہمارا ساتھی تھا جنہیں عمر قید کی سزا ہوئی جبکہ کامریڈ شاہدہ جبین کا عثمان غنی تختہ دار پر جھول گیا۔ڈاکٹرز بیدہ ملک کو مارشل لاء کے خلاف جدوجہد پر گرفتار کر کے شاہی قلعہ میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔پھر وہ کئی سال کوٹ لکھپت جیل میں ہمارے ساتھ رہیں۔بہت بہادر خاتون تھیں محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ان کی دل سے عزت اور احترام کرتی تھیں۔انہیں ایم پی اے بنایا پھر ان کی بہو نور النساء کو اسمبلی میں بھیجا۔کبھی اسلام آباد آنا ہو تو اکثر راولپنڈی میرے گھر مہمان بنتیں۔میں نے ایک دن کہا کہ آنٹی مجھے تو خوشی ہے آپ میرے پاس آتی ہیں مگر آپ پنجاب ہاؤس میں ٹھہریں تو آپ کو 5 سٹار ہوٹل کی سہولیات والا کمرہ ملے گا تو کہنے لگیں۔بیٹا ہم نے جیل اکٹھے کاٹی ہے مجھے یہاں بڑا سکون ملتا ہے کہ ہم اپنا دکھ سکھ سانجھا کر لیتے ہیں۔رات گئے وہ پرانی یادیں تازہ کرتی رہتیں۔آہ ماؤں جیسا پیار کرنے والی ڈاکٹرز بیدہ ملک ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔وہ ہمیشہ پاکستان پیپلز پارٹی کی تاریخ اور ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گی۔وہ 16 جون 2021ء کو وفات پا گئی تھیں۔(شکریہ سرور ناز اطلاع دینے کا وگرنہ ہمیں پتہ نہ چلتا۔)

دسمبر 1988ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو شہید نے وزیر اعظم کا حلف اٹھانے کے بعد پہلی نشری تقریر میں پاکستان بھر میں عمر قید کی سزا کاٹنے والے مارشل لاء کے سیاسی قیدیوں کی رہائی کا اعلان کیا۔رہائی کے بعد پاکستان ٹیلی ویژن سمیت مختلف اخبارات جرائد نے سیاسی قیدیوں کے انٹرویو شائع کیے۔مجھ سے کراچی کے رسالے شاید معیار نام تھا کے صحافی نے سیاسی قیدیوں پر ہونے والے تشدد کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ سب سے زیادہ تکلیف دہ ٹارچر کونسا ہوتا ہے۔میں نے کہا ٹارچر کوئی بھی ہو جسمانی اذیت کے لیے ہوتا ہے مگر مجھے سے زیادہ تکلیف لتر پریڈ اور تلووں پر ڈنڈے برسانا لگا دونوں کی تصویر نیچے موجود ہے جبکہ کوڑے بھی اس میں شامل ہیں مگر

5 تا 10 کوڑے جو سیاسی قیدیوں کے پچھوڑاے پر لگتے تھے وہ 10-15 منٹ کی بات ہوتی تھی انہیں یہ سہولت ضرور تھی کہ انہیں کوڑے مارنے کے بعد جیل کے ہسپتال میں منتقل کر دیا جاتا تھا ۔جبکہ لتر پریڈ اور تلووں پر ڈنڈے برسانا اس کی کوئی حد نہیں ہوتی تھی مجھے راولپنڈی کے کوتوالی تھانے میں پوری رات تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ پولیس انسپکٹر نے دو سپاہیوں کو کہہ رکھا تھا کہ 50 لتر مارنے کے بعد ہاتھ روکنا لتر پریڈ میں بریک آتی تو تلووں پر ڈنڈے مارے جاتے اس طرح پوری رات میں کوئی 250 لتر مارے گئے تھے سنا تھا کہ 4-5 لتر کے بعد جسم سن ہو جاتا ہے پھر لتر اثر نہیں کرتا سب بکواس تھا۔ ہر لتر پر درد بڑھتا ہی تھا کم نہیں ہوتا جیسے نیچے تصویر میں کوڑے مارنے کے بعد اس قیدی کا لتاڑا کر رہے ہیں تا کہ خون جمنے نہ پائیے اس طرح لتر اور ڈنڈے مارنے کے بعد ایکسرسائز کروائی جاتی تھی کہ خون نہ جمے مگر جب مجھے کوتوالی تھانے سے شاہی قلعہ کے عقوبت خانے میں منتقل کیا گیا تو کچھ دنوں بعد میں نہایا تو محسوس کیا کہ پیچھے جہاں ناڑہ باندھا جاتا وہاں خون کی پپڑیاں بنی ہوئی تھیں ۔اس سے بڑا ٹارچر مجھے رت جگا محسوس ہوا شاہی قلعہ پہنچتے ہی مجھے سلاٹر ہاؤس منتقل کر دیا گیا جو ایک بڑا ہال نما کمرہ جہاں سیاسی قیدیوں سے تفتیش کے نام پر تشدد کیا جاتا تھا۔ وہاں جاتے ہی میری تفتیش شروع ہوئی۔ تفتیش مکمل ہوئی تو مجھے سخت نیند آ رہی تھی تو انہوں نے ہنستے ہو کہا کہ کدھر تمہارے تو 72 گھنٹے رت جگے کا حکم ہے اس تین دن کے رت جگے میں میں صرف کھڑا رہ سکتا تھا یا چل سکتا تھا۔ بیٹھنا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگانا منع تھا۔ 72 گھنٹے بعد میری اتنی بری حالت تھی کہ لگتا تھا دماغ پھٹ جائے گا۔ جسم تھکاوٹ سے چور چور تھا۔ اس کے بعد مجھے سیل میں منتقل کیا گیا۔ بھلا ہو وہاں موجود اقبالی (پنجابی مورچہ) شیخ شاہد مرحوم، کاظم نقوی بھکر، چوہدری اسلم ایڈووکیٹ، چاچا مسعود اقبال لودھی جنہوں نے میرا جسم دبایا لتاڑا کیا پھر میں خوب ڈٹ کر سویا۔ جیل ہو یا شاہی قلعہ جیسے عقوبت خانے اچھے دوست ساتھی ہوں تو وقت ہنستے کھیلتے گزر جاتا ہے۔ شام ہوتے ہی مسعود اقبال کی سریلی آواز شاہی قلعے میں گونجنے لگتی۔ الذوالفقار کے ترانے اور فلمی گانے سب کچھ سننے کو ملتا۔ میں اس زمانے کو برا نہیں خوبصورت وقت کہتا ہوں۔

سیاسی قیدی ہیں ہم مشقت نہیں کریں گے تو ہم سب کو قصوری چکیوں میں بند کر دیا گیا جو کہ جیل کے اندر جیل ہوتی ہے۔ ہم نے فوری طور تا دم مرگ بھوک ہڑتال کا فیصلہ کیا رات گئے جب جیل میں لوڈ شیڈنگ تھی ۔لال ٹینوں کی روشنی میں ہمیں قصوری چکیوں سے نکالا گیا اور پرانے

احاطے میں منتقل کر دیا گیا۔ سننے میں آیا کہ جب شام کو ہر جیل کی طرح جیل حکام نے آئی جی جیل خانہ جات کو رپورٹ دی کہ 14 سیاسی بھوک ہڑتال پر ہیں تو اس جیل سپرنٹنڈنٹ کو ڈانٹا کہ انہیں کھول دو ابھی چند مہینے پہلے تو 54 دن بھوک ہڑتال سے اٹھے ہیں۔ اس طرح ہمارا اور جیل حکام کا خاموش معاہدہ ہو گیا نہ وہ ہم ملنگوں کو چھیڑیں گے نہ ہم انہیں۔ اور پہلی بار سزا کے بعد ہمیں اپنا کھانا پکانے کی بھی اجازت مل گئی۔ 5 سال جیل کی دال صبح شام کھا کھا کر یہ بھی بھول چکے تھے کہ مارچ کے مہینے میں کون کون سی سبزی ہوتی ہے خیر جیل کا قیدی جو ہمارے پیسے کا سودا لانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ جو جیل آپ کو تصویر میں دکھائی دے رہی ہے۔ یہ 1876ء کی بنی ہوئی ہے اس کے لیے ٹن وزنی دروازوں پر ٹاٹا انڈیا لکھا ہوا تھا۔ میرا نہیں خیال کہ جیل کا یہ حصہ ابھی تک سلامت ہوگا۔ کیونکہ اس کے ساتھ پہلے ہی نئی جیل بن چکی تھی۔ اس بھی توڑ کر ضرور نیا بنا دیا گیا ہوگا۔

تصویر میں موجود ساتھیوں میں 6 افراد اب دنیا میں نہیں رہے۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

آغا شورش کاشمیری ایک دن بھٹو صاحب کے پاس گئے تو بھٹو مرحوم نے کہا: آکسفورڈ یونیورسٹی میں میری لڑکی اور لڑکا دونوں پڑھتے تھے۔ آپ بھی اپنی لڑکی اور لڑکے کو بھیج دو، حکومت وظیفہ دے گی۔

شورش نے کہا میں مشرقی طرز کا آدمی ہوں۔ مغربی تہذیب میں اولاد کو بھیج کر خراب نہیں کرنا چاہتا۔

تو بھٹو مرحوم نے کہا کہ شادمان کالونی ،لاہور میں دو پلاٹ پڑے ہیں ،تم کم ریٹ پر حکومت سے خرید لو اور ایک کو بیچ کر اپنا پلاٹ بنالو۔تو شورش نے جواب دیا: جناب سر چھپانے کے لیے جگہ موجود ہے۔میں کوٹھی نہیں بنانا چاہتا۔

شورش اپنے گھر واپس آئے اور سارا قصہ اپنی بیٹی کو سنا دیا۔تو بیٹی نے کہا کہ: ابو بھٹو صاحب پلاٹ دے رہے تھے تو لے لیتے ،سرکاری زمین ہے ہم پیسے جمع کرا دیتے ہیں بات صرف اتنی ہے کہ وہ کوئی اور لے جائے گا۔بس ہمیں رعایت ہی مل جاتی ۔آپ نے ہمارے مستقبل کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

تو جواب میں شورشؒ نے فرمایا کہ: دنیا یہیں رہ جائے گی ۔میں بھٹو صاحب سے ایک ایسا تحفہ لے کر آیا ہوں جو قبر میں مجھے کام آئے گا بس یہ بات کہنی تھی۔

تحریک ختم نبوت کے اکابرین بھٹو مرحوم اور شورشؒ کے درمیان کی گفتگو سے بالکل ہی لاعلم تھے ۔کچھ ہی دنوں بعد شورشؒ بیمار ہوئے اور انتقال فرما گئے ۔جنازے میں حضرت مفتی محمود صاحبؒ مولانا غلام غوث ہزارویؒ ،مصطفی کھر ،کوثر نیازی ،معراج خالد ،حفیظ پیرزادہ اور دیگر حضرات شریک ہوئے ،ہزاروں کا اجتماع تھا ،مجمع سارا حیران تھا کہ بھٹو مرحوم اور شورشؒ کا کافی دوستانہ تعلق تھا پھر بھی جنازے میں شریک نہیں ہوئے ۔ان کے انتقال کے دوسرے دن ہی بھٹو صاحب چین چلے گئے۔

پانچ روزہ دورے کے بعد واپس آئے تو ایک دن پنڈی میں رہے ،دوسرے دن لاہور آئے اور شورشؒ کی قبر پر حاضری دی۔فاتحہ خوانی کی اور شورشؒ کے گھر تعزیت کے لیے بھی گئے۔

بھٹو مرحوم نے تعزیت کے دوران کہا کہ جنرل عبدالعلی اور جنرل ظفر چوہدری قادیانی ہیں ، شورشؒ نے میرے پاس آ کر کہا: آپ میرے بچوں کو آکسفورڈ یونیورسٹی نہ بھجوائیں اور پلاٹ بھی مجھے نہ دیں بس ان قادنیوں کو ہٹا دیں یہی تحفہ میں آپ سے لینے آیا ہوں تو بھٹو مرحوم نے کہا میں ہٹا دوں گا اور میں نے وعدہ کیا تھا ،بغیر جنرلوں کے ہٹائے میں اگر اس جنازے میں آتا تو وعدہ خلافی ہوتی ،میری آنکھ میں شرم تھی ،میں کیسے جنازے میں شریک ہوسکتا تھا دوسرے دن میرا چین کا سفر تھا اگر میں اس کو ہٹا کر جنازے میں آتا تو میری غیر حاضری میں شاید اندیشہ تھا کہ اتنی بڑی تبدیلی کے بعد ملک میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے تو میں اس لیے جنازے میں نہیں آیا ،چین چلا گیا ،واپس آیا

۔آج میں نے ان دونوں جنرلوں کو فارغ کر دیا ہے۔شام پانچ بجے کی خبروں میں آ جائے گا اب میں سرخرو ہو کر آپ حضرات کے پاس آیا ہوں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

میر مرتضیٰ بھٹو

ذوالفقار علی بھٹو کا بیٹا 18 ستمبر 1954 کو کراچی میں پیدا ہوا۔ابتدائی تعلیم کراچی سے حاصل کی۔بیچلر ڈگری ہارورڈ یونیورسٹی سے اور ماسٹر ڈگری آکسفورڈ سے حاصل کی۔1977ء میں اپنے والد کی رہائی کے لیے تاریخی مہم چلائی اور دنیا کے اہم ترین رہنماؤں سے ملاقات کی۔

1993 میں پاکستان واپس آتے ہی گرفتار ہو گئے۔بعد میں ضمانت پر رہا ہو گئے۔

1993 میں لاڑکانہ سے سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور پیپلز پارٹی شہید بھٹو گروپ کی بنیاد رکھی۔ 20 ستمبر 1996ء کو کراچی پولیس فائرنگ سے اپنے ساتھیوں سمیت ہلاک ہو گئے۔

عبدالرزاق جھرنا

پیپلز پارٹی کا یہ جیالہ 1957ء کو بھکر میں پیدا ہوا۔ وہ فلموں کا شوقین تھا اور ایکٹر گلوکار بننا چاہتا تھا 1977 میں بارہویں کلاس کا طالب علم تھا۔ روزگار کی تلاش میں مشرق وسطی جانا چاہتا تھا۔ دبئی جانے کے لیے اس کے کاغذات مکمل تھے۔ اسی دوران ان کی ملاقات راشد ناگی سے ہوئی۔ 1978ء میں ضیاء آمریت کی طرف راشد ناگی کے کہنے پر خود کو آگ لگا دی۔ تاہم لوگوں نے

اسے بچالیا۔ناگی نے اسے ہسپتال سے اٹھا کر جیل پہنچا دیا۔ جہاں اس کا آدھا بدن جل چکا تھا۔ 1983ء میں ظہور الہی قتل کیس میں 26 سال کی عمر میں پھانسی ہوگئی۔ جب اسے پھانسی دینے کے لیے لے جایا جارہا تھا تو ایک ٹانگ پر رقص کرتے ہوئے بھٹو کے نعرے لگاتا پھانسی گھاٹ پر پہنچا۔

جے کر یاردے ناں دا ملے طعنہ
جھولی پا لیے تھلے سیٹے ناں
جے کر یار دے ناں دی ملے سولی
جھوٹا لے لیے پچھاں ہٹیے ناں

ایاز سموں

پیپلز پارٹی کا یہ جیالہ 1959ء میں سندھی خاندان میں پیدا ہوا۔شروع شروع میں سندھی نیشنلسٹ گروپ میں شامل ہوا۔ 1977ء میں PSF میں شمولیت اختیار کی۔ دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہو کر جیل پہنچ گیا۔ 1985ء میں فوجی عدالت نے سزائے موت سنائی اور 26 جون کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی کے وقت اس کی عمر 26 سال تھی۔

ہائی جیکنگ کیس

ہائی جیکنگ کیس میں 1983 تا 1985ء تک چھ افراد کو دہشت گرد قرار دے کر ملٹری کورٹ نے انہیں پھانسی کی سزا دی۔ان سب کا تعلق PSF سے تھا۔

ناصر بلوچ

پیپلز پارٹی کا یہ سپوت 1955 میں صوبہ سندھ میں پیدا ہوا۔میٹرک کے بعد پاکستان سٹیل ملز کراچی میں بطور ڈرائیور بھرتی ہوا۔اس پر الزام تھا کہ اس نے سٹیل ملز کی بس میں تینوں ہائی جیکروں سلام اللہ ٹیپو، ناصر جمال اور راشد ٹیگی کو دہشت گردوں کی مدد کے لیے ائیر پورٹ پہنچایا۔ ملٹری کورٹ نے انہیں موت کی سزا دی اور 1984ء میں اسے اس وقت پھانسی دی گئی جب وہ جیل میں FA امتحان دے رہا تھا۔

ادریس بیگ

پیپلز پارٹی کا یہ سپوت 1962ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوا۔ 16 سال کی عمر میں پی ایس ایف جوائن کی۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد فوجی آمریت کے خلاف احتجاجی ریلیوں میں شریک ہونے کے الزام میں 1982ء میں گرفتار ہوا۔ 1983ء میں اپنے دیگر ساتھیوں ادریس طوطی اور عثمان غنی کے ساتھ 21 سال کی عمر میں پھانسی کی سزا پائی۔ تینوں جیالوں کو پھانسی دینے کے لیے ایک ہی پھندا استعمال کیا گیا تھا۔

ادریس طوطی

پیپلز پارٹی کا یہ بہادر نوجوان 1963ء کو دھرم پورہ لاہور میں پیدا ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں 1979ء کو پی ایس ایف میں شامل ہوا۔ ضیاء آمریت کے دور میں گھر پر مسلسل چھاپوں اور اہل خانہ کو ہراساں کرنے پر کابل چلا گیا۔ واپسی پر گرفتار ہوا۔ 1983ء میں پھانسی دی گئی۔ پھانسی کے وقت آپ کی عمر 21 سال تھی۔

عثمان غنی

1964ء کو راولپنڈی پیدا ہوئے ۔سکول کے زمانے میں 1979ء کو پی ایس ایف میں شامل ہوئے ۔ریاست مخالف سرگرمیوں اور ضیاء مخالف احتجاجی ریلیوں میں شریک ہونے کے الزام میں گرفتار ہوئے ۔جیل کی اسیری کے دوران سگریٹ کے پنوں سے تاج بنا کر اپنی چھوٹی بہن شاہدہ جبین کو دیا کہ جب بے نظیر بھٹو میری تعزیت کے لیے ہمارے گھر آئیں تو انہیں یہ تاج پہنانا۔فوجی عدالت کی طرف سے سزا سنائی گئی اور 1983ء میں انھیں پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی کے وقت آپ کی عمر 19 سال تھی ۔عثمان غنی کی پھانسی کے بعد اس کی بہن شاہدہ جبین نے PSF جوائن کر لی۔

محبت کی انتہا

4اپریل 1979ء کو گلگت کے جیالے محمد اسمعیل نے ریڈیو پر اپنے محبوب قائد ذوالفقار علی بھٹو کی خبر سنی تو ان کی جدائی برداشت نہ کر سکا اور محبت عشق کی اگلی منزل تک چلی گئی ۔اس نے جلتے ہوئے تیل کا چولھا اپنے اوپر انڈیل لیا۔ جیالے کے سارے جسم کو آگ نے لپیٹ لیا۔اس کا منہ، ہاتھ، ٹانگیں اور جسم کے دیگر اعضاء جل گئے ۔کئی مہینے زندگی موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد وہ زندہ بچ گئے ۔ جب محترمہ بے نظیر بھٹو پہلی مرتبہ وزیر اعظم بنی تو انہوں نے گلگت آ کر خود محمد اسمعیل سے ملاقات کی اور سرکاری ملازمت دلائی ۔طویل عرصہ گزرنے کے بعد جب بھی اس کے سامنے بھٹو کی پھانسی کا ذکر کیا جائے تو اس کی آنکھیں بے ساختہ آنسوؤں سے چھلک پڑتی ہیں۔

کیا یہ وزیر اعظم نہیں تھا؟

کیا اس نے ملک کو آئین نہیں دیا؟
کیا اس نے پاکستان کو ایٹمی قوت نہیں بنایا؟
کیا اس نے 90 ہزار جنگی قیدی واپس نہیں لائے؟
اگر یہ سچ ہے تو یہ سلوک کیوں؟

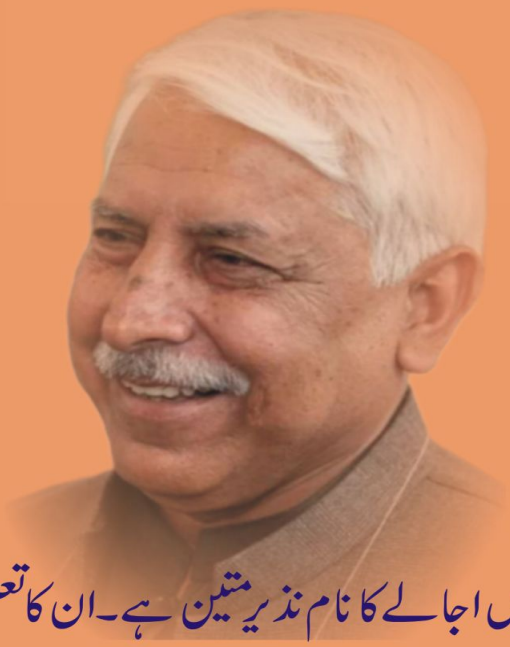

اندھیروں میں اجالے کا نام نذیر متین ہے۔ان کا تعلق پاکستان کے قدیم ترین شہر ہڑپہ سے ہے۔اسی لیے وہ اپنی ثقافت سے جڑے ہوئے ہیں۔صحافت، مذہبی وسماجی خدمات کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔شروع دن سے انسانیت کی خدمت سے سرشار ہیں۔جمہوریت کے لیے قربانیاں دینے والے کارکنوں کے بڑے مداح ہیں۔ان کی یہ خوب صورت کاوش ''انمول لوگ'' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔وہ ہر مشکل وقت کے ساتھی ہیں۔

ویلے اوکھڑے سوکھڑے لنگھ جاندے
گلاں یاد سجن دیاں رہندیاں نیں

چودھری محمد بشیر ایڈووکیٹ